سسکتی چاندنی

فریدہ زین

شالیمار پبلیکیشنز

سلسلۂ مطبوعات نمبر: (۳۲)

سنہ اشاعت : جون ۱۹۷۶ء

زیر اہتمام : انور مسعود

طباعت : نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، چار کمان۔ حیدر آباد ۲

سرورق : سعید بن محمد نقاش

کتابت : عبدالحق پرویز

قیمت : بارہ روپے RS: 12/-

ڈیلکس لائبریری ایڈیشن RS. 15/-

ناشر:

شالیمار پبلیکیشنز، نیا ملک پیٹ۔ حیدر آباد 500036

ملنے کے پتے:

- شالیمار پبلیکیشنز (سیلز آفس) ترپ بازار، حیدر آباد 500002
- برگ آوارہ، ہفت روزہ۔ ترپ بازار، حیدر آباد 500001
- مسز فریدہ زین، پرنسپل فلاور زون اسکول، ریڈ ہلز۔ مکان نمبر 49-5-11۔ حیدر آباد
- مسز فریدہ زین پر محمد زین العابدین عابدی بی اے ایل ایل بی ایڈوکیٹ بھونگیر ضلع نلگنڈہ (اے پی)
- اردو اکیڈیمی بک ڈپو۔ خیریت آباد۔ حیدر آباد
- مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ بمبئی، دہلی، علی گڑھ

فہرست

۷۸۶
۹۲

انتساب

والدِ مرحوم (جناب محمد احمد حسین صاحب بی۔اے ڈپٹی کلکٹر) کے
نام جن کی اچانک اور بے وقت موت نے میری روح کو غم کا
وہ جام پلایا کہ آج بھی میں یہ کہنے پر مجبور ہوں !

درد ہی درد بھر گیا دل میں
اتنا حساس کر دیا غم نے
جب کسی آنکھ سے گرا آنسو
اپنی پلکوں پہ لے لیا ہم نے
(شاد)

فریدہ زین

فریدہ زین حیدر آباد کے افسانہ نگاروں میں ایک خوش گوار اضافہ ہیں۔ ان کی کہانیوں میں محبت کی قربت اور دوری کی دھوپ چھاؤں رومانی فضاؤں کی عکاسی ملتی ہے۔

فریدہ زین کے افسانوں کا موضوع ایسے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں ہیں جو کبھی چاہت کے نشے سے سرشار ہیں اور کبھی ہجر کی دوری سے اداس ہیں۔ ان کی کہانیوں کے ہیرو ہیروئین سماج اور قدرت کے ستائے ہوئے ایسے نوجوان ہیں جن کے مسائل کو فریدہ زین نے قریب سے دیکھا ہے اور محسوس کیا ہے۔ وہ خوب صورت نثر لکھتی ہیں اور ہلکے پھلکے موضوعات کو اپنی خوب صورت نثر میں ڈھال کر کہانی بنا دیتی ہیں۔

اردو میں رومانی کہانیوں کا رواج ختم سا ہو گیا ہے لیکن فریدہ زین نے ان کہانیوں میں سماج اور مذہب کی جکڑ بندیوں کا سہارا لیکر انھیں زیادہ جاذب توجہ بنا دیا ہے خصوصاً عورت کی نفسیات کا انھوں نے بڑی گہرائی سے مطالعہ کیا ہے۔

"سسکتی چاندنی" ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ مجموعہ مقبولیت حاصل کرے گا۔

جیلانی بانو

۲۰ / مارچ ۹۷ء

جیلانی بانو
(حیدر آباد)

Residence Telephone
(201) 227-0646

87, Clinton Road,
Fairfield,
New Jersey - 07006
U-S-A.

۳۰ر اپریل ۷۶ ۱۹ء

عزیزہ فریدہ زین، دعائیں

"بیسویں صدی" کے تازہ شمارے میں آپ کا افسانہ بعنوان "کانٹوں سے دل کے چاک سیئے" مجھے بے حد پسند آیا۔ اس بار بھی کہانی کے انجام پر آنکھیں نمناک ہو گئیں اور یہی سب سے بڑا ثبوت آپ کی کامیابی کا ہے فن کار وہی ہے جو دل کے تاروں کو چھو لے۔ مولانا حالی کا یہ شعر نہ بھولیئے : ؎

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں
اب ٹھہرتی ہے دیکھیئے جا کر نظر کہاں

پہلے یہ ارادہ کیا کہ آپ کو خط لکھوں اور آپ کے افسانے پر نثر ہی میں تبصرہ کر دوں اور مبارک باد پیش کر دوں۔ تو را ہی دل نے کہا کہ منظوم تبصرہ کیوں نہ ہو جائے۔ چنانچہ اشعار ہوتے چلے گئے اور یہ نظم ہو گئی جو آپ کی نذر کرتا ہوں۔

آپ کا
باوا کرشن گوپال مغموم

عزیزہ فریدہ زین کی نذر

○

آفریں باد! اے فریدہ زین
تُو رہے شاد، اے فریدہ زین

تُو نے لکھا ہے خوب افسانہ
تیرا اسلوب ہے جُداگانہ

طرزِ تحریر میں لطافت ہے
جملے جملے میں کیا فصاحت ہے

تیرا ہر حرف شرحِ حُسن و جمال
تیرے الفاظ کہکشاں تمثال

تیری ہر سطر موتیوں کی لڑی
ہر عبارت ہے کیسی ہیروں جڑی

تیرے لفظوں میں ہے ترنّم بھی
نالۂ غم بھی ہے، تبسّم بھی

خوب ہے انتخاب شعروں کا
حُسن ہے لاجواب شعروں کا

نقطے نقطے میں ہیں نکات سنئے
داستاں میں ہیں واقعات سنئے

نفسیات و مزاجِ انساں پر
کس قدر ہے عمیق تیری نظر

دلنشیں ہے ترا خلوصِ بیاں
برقِ تاثیر ہے رواں دواں

کہیں فقروں میں ہے بلاغت بھی
کہیں مفہوم کی نزاکت بھی

ترجمانیٔ جذبہ ہائے نہاں
کبھی آساں نہ تھی، نہ ہے آساں

تُو کہ ہے مایہ دارِ ذوقِ سلیم
مرحلے طے کئے بہ قلبِ صمیم

تیری محنت نے کر دیئے ہموار
فن کے رستے، جو تھے بڑے دشوار

جانے پہچانے ہیں ترے کردار
اُن کی سیرت کا خوب ہے اظہار

نفسِ مضموں ہے کتنا پاک و صاف
منعکس ہے ترا دلِ شفّاف

"عقل" و "جذبات" کی یہ قیل و قال
"عشق" کے باب میں یہ استدلال

ہے فسانے میں لطف و دلچسپی
کتنا سسپنس ہے حکایت میں
موڑ دے کر نیا کہانی کو
خونِ ہر آرزوئے دل پینا
اختتام آہ، اس کہانی کا
اُف! یہ تیرا بیانِ درد و غم
تُو ہے اک کامیاب فن کارہ

اور طوالت کہیں نہیں کھٹکی
اُف! یہ محرومیاں محبت میں
کر دیا غم فزا کہانی کو
اور کانٹوں سے چاکِ دل سینا
ہائے! انجام حُسنِ فانی کا
ٹپکی پڑتی ہے آنکھ سے شبنم
تُو ہے اک برق تاب فن کارہ

تیرے فن نے نئی جِلا پائی
تیری منزل تجھے نظر آئی

باوا کرشن گوپال مغموم

(۲۵-۴-۷۶)

کچھ اپنے بارے میں :

یہ اور بات ہے کہ تعارف نہ ہو سکا
ہم زندگی کے ساتھ بہت دُور تک گئے
(مجاز)

جس قلم سے میں نے آج تک کئی کہانیاں لکھیں آج خود کے بارے میں لکھتے ہوئے کچھ تذبذب میں ہوں۔ اپنے بارے میں لکھنا ہمالیہ کی چڑھائی اور طوفان میں کشتی رانی سے کہیں زیادہ مشکل ہے پھر بھی قارئین کو یہ بتا دینا ضروری سمجھتی ہوں کہ میں نے کب سے اور کیوں کہانیاں لکھنی شروع کیں۔

۲۳ اکٹوبر کی صبح سورج کی پہلی کرن میری زندگی کا پیام لے آئی۔ بچپن سے کہانیاں سننے کا شوق رہا۔ کھاتے وقت اور سوتے وقت کہانیاں سننا میرا مشغلہ تھا اور جب میں صرف آٹھویں جماعت کی طالبہ تھی میں نے قلم چلانا بھی سیکھ لیا۔ ننھی منی کہانیاں میرے قلم سے نکلتی رہیں اور روزنامہ رہنمائے دکن میں بچوں کے صفحے پر چھپنے لگیں۔ گلشن زیست پر ان دنوں صرف کلیوں اور پھولوں کی بہار تھی پھر جیسے جیسے وقت بڑھتا رہا کلیاں چٹکنے لگیں پھول مرجھانے لگے کانٹوں کی حقیقت سمجھ میں آنے لگی لفظ خزاں کا مفہوم بھی سمجھ میں آگیا۔ پھر کہانیوں کا رنگ بدلا، ہلکے پھلکے افسانے جو روزمرہ کی زندگی کی عکاسی کرتے تھے میں نے لکھنے شروع کیے

انہی دنوں میں نامپلی گرلز اسکول سے میٹرک کر چکی تھی۔ کالج کی فضا میں قدم رکھتے ہی ادبی ذوق کو راہیں مل گئیں۔ ریڈی کالج میں محترمہ جہاں بانو نقوی اور ونیتا مہا ودیالیہ میں محترمہ طاہرہ نقی نے میری ہمت بندھائی۔ میں نے ڈرتے ڈرتے افسانہ نویسی کے انٹر کالج مقابلے میں حصہ لیا۔ میرا افسانہ اس مقابلہ میں اول آیا۔ گویا میرے لڑکھڑاتے قدم جمے۔ ہمارا گھرانہ قدامت پرست تھا۔ لڑکیوں کو کالج میں تعلیم دلوانا ہی نامناسب سمجھا جاتا تھا افسانہ لکھنا تو بہت معیوب بات تصور کی جاتی تھی۔ چنانچہ میری تحریریں کاپیوں کے اوراق میں محفوظ رہیں۔

پھر زندگی میں ایک خوشگوار دور کا آغاز ہوا۔ میں بیاہی گئی زین العابدین سعید صاحب ایڈوکیٹ پھر نگر میرے شریکِ حیات بن گئے۔ ان کی بھرپور رفاقت نے میرے ذہن کو توانائی بخشی اور کھلی فضا میں چھوڑ دیا۔ میں بے جھجک کہانیاں لکھنے لگی اور ان ہی کے اصرار پر میں نے اپنی کہانیاں اشاعت کے لئے بھیجیں۔ ۱۹۷۰ء میں میری باقاعدہ ادبی زندگی کا آغاز ہوا۔ میری کہانیاں "خاتونِ مشرق"، "شاعر"، "بیسویں صدی" اور "روشنی" میں چھپ چکی ہیں۔ ایک افسانہ "چراغِ رہ گذر" کو "پیار کی منزل" کے نام سے دہلی میں اسٹیج کیا گیا۔ آل انڈیا ریڈیو کے نیرنگ پروگرام میں بھی میں نے اپنے افسانے سنائے۔ میں اپنی زندگی سے مسرور تھی شادماں تھی۔ زین صاحب نے ہر قدم پر میری رہنمائی کی وہ میرے لئے ایک شمع رہگذر بن گئے۔ میں باغِ زندگی کی گلگشت کر رہی تھی کہ اچانک ایک انقلاب آگیا ایک حادثہ وقوع پذیر ہوا میرے والد محمد احمد حسین صاحب جو سنگاریڈی پر پٹائے کو گلگٹر تھے ان کا اچانک ہارٹ فیل ہوگیا۔ اس حادثے نے میرے دل و دماغ کو جھنجھوڑ دیا۔ میں نے پہلی بار اپنے دل کو تڑپتے دیکھا اپنی روح کو گھائل پایا! یہ حادثہ میری زندگی کا وہ سرمایہ ہے جس میں ظرفِ غم کی دولت ہے، آنسوؤں کے موتی ہیں، آہوں کے نگینے ہیں

اور تڑپ و کسک کے انمول ہیرے ہیں۔ وقت جیسا مسیحا بھی اس زخم کو مندمل نہ کر سکا۔ یہی وجہ ہے کہ میرے قلم میں ڈھلتی شاموں کی اُداسی، برفیلی راتوں کی خاموشی، ویران صحراؤں کا سناٹا ہے۔

میں نے زندگی کی تلخ حقیقتیں دیکھیں۔ انسان کی بے بسی دیکھی، آنسوؤں کی وہ ناکام برسات دیکھی جو سنگدل زمین کو گیلا نہ کر سکے۔ بقول فانی ؎

دنیا میں حال آمد و رفت بشر نہ پوچھ
بے اختیار آ کے رہا، بے خبر گیا

اُس زہریلی شام میں نے اپنی قسمت کو سب سے بڑی دولت سے محروم ہوتے دیکھا اپنی ماں کی چوڑیاں ٹوٹتے دیکھا۔ اپنے بھائی بہنوں کو بلکتے دیکھا۔ ایک انسان کو چار کاندھوں پر سوار ساری دنیا سے ناطہ توڑ کر جاتے ہوئے دیکھا۔ یہی میرے احساس کی پہلی شام تھی اور میں نے سوچنا شروع کیا زندگی کبھی قوس و قزح کا حسین دائرہ ہے تو کبھی تاروں بھرا آسمان، کبھی اُجڑا ہوا گلشن ہے تو کبھی گرجتے بادلوں کا طوفان۔ میرے خیالات کا تلاطم مجھے پاگل نہ بنا سکا لیکن میرے قلم کو درد کی سیاہی مل گئی۔ میں نے دس سالہ تجربات کا نچوڑ اپنے افسانوں میں سمو دیا۔ ابّا کے انتقال کے بعد سے میں نے جو کچھ دیکھا، زندگی سے موت تک، سحر سے شب تک، عروج سے زوال تک، محبت سے نفرت تک، خلوص سے بے گانگی تک، راحت سے مصیبت تک، اطمینان سے فکر تک، بننے سے بگڑنے تک، جینے سے مرنے تک، پھول سے خار تک، اجالوں سے اندھیروں تک، افسانوں سے حقیقت تک کے ہر لمحے کو ذہن کے محل میں مقید کر لیا۔ رشتے داروں کا درد دیکھ لیا۔ بے بسی اور مجبوری کے صبر آزما لمحوں سے گذر چکی، میں نے محسوس کیا خوشی کے پیچھے غم ضرور ہے، فرق صرف فاصلے کا ہے کبھی یہ طویل ہو جاتے ہیں اور کبھی مختصر ہو جاتے

ہیں۔ اسی ذہنی انتشار کے دور میں زین صاحب نے میرے ہاتھ میں قلم تھما دیا۔ پھر میں نے جو کچھ بھی لکھا وہ آپ کی نذر ہے ہیں نے اپنی کہانیوں میں دلوں کی صداقت، جذبوں کی پاکیزگی، خیالات کی بلندی، احساس کی تپش، نظریات کی آفاقیت، کردار کی پختگی اور عمل کی انفرادیت کو ہمیشہ جگہ دی۔ میں نے اپنے افسانے کے موضوع کے لئے ایثار کی بلند پروازیوں، کردار کی عظمتوں اور محبت کی محرومیوں کا سہارا لیا۔ میں اپنی کہانیوں میں کردار پر زیادہ زور دیتی ہوں کیونکہ کسی ملک یا قوم کی اجتماعی ترقی انفرادی ترقی پر منحصر ہے آج کا معاشرہ صحت مند ذہنوں کو جنم دینے سے معذور ہے میں ایسے ذہنوں کو رنگ و نور سے آراستہ کر کے پاکیزہ بنانے کی حقیر سی کوشش کر رہی ہوں۔

میں اپنے تمام بہی خواہوں کی تہہ دل سے مشکور ہوں جنھوں نے اس افسانوی مجموعے کی اشاعت کے لئے مجھ سے اصرار کیا۔ اس سلسلے میں میں جناب انور مسعود شالیمار پبلیکیشنز کی بے حد ممنون ہوں جنھوں نے اس کتاب کی اشاعت میں شخصی دلچسپی لی۔ میں خاص طور پر جناب سعید بن محمد صاحب آرٹسٹ کی بھی مشکور ہوں جنھوں نے "سسکتی چاندنی" کو رنگوں کا پیرہن دیا۔

ایک چراغِ رہ گزر

"شہاب بھیا آ گئے! شہاب بھیا آ گئے!" گھر کے سارے بچے غل مچا رہے تھے۔

"اوہ شہاب تم!" اسلم نے اسے بھینچ لیا۔

"ہلو مائی ڈیر بھیا! آہا پورے پچیس سال کے نوجوان معلوم ہو رہے ہو۔ سو اسمارٹ ینگ مین...." شہاب نے اسلم کو گود ہی میں لے لیا۔

"ارے رے... یہ کیا کرتے ہو؟ میں جانتا ہوں تم فوجی آدمی ہو۔ دیکھو تمہاری بھابی آ رہی ہیں نا۔" اسلم نے خود کو چھڑاتے ہوئے کہا۔

"کہاں ہیں وہ ——؟ شادی بھی کر لی آپ نے۔ اور ہمیں محروم رکھا بھابی کے دیدار سے۔؟ بلائیے نا! شہاب نے اسلم کو گود سے اتار دیا۔

"ان سے ملو دیبا! یہی شہاب ہے میرا چچا زاد بھائی! مگر یوں سمجھو کہ اپنوں سے بڑھ کر ہے۔ جب اس نے آنکھ کھولی تو میری ہی انگلی تھام کر چلنا سیکھا —— اور مسٹر شہاب یہ ہیں آپ کی بھابی مسز دیبا اسلم!" اسلم نے تعارف کروایا۔

"تسلیمات!" شہاب قدرے جھک گیا۔

"بہت خوشی ہوئی تم سے مل کر!" اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

"لیکن مجھے خوشی کے ساتھ دکھ بھی ہوا ہے!" شہاب نے کہا۔

"وہ کیوں ــــ؟" اسلم پائپ صاف کرتے ہوئے بولا۔

"اس لئے کہ مجھے آپ دونوں کا جوڑا پسند نہیں آیا!" وہ منہ سکوڑ کر بولا۔

"What ــــ؟ کیا معنی؟" اسلم نے شٹپٹا کر سوال کیا۔

"مطلب یہ کہ اندھیرا اجالا بھی ساتھ چلتے ہیں؟ دیبا بھابی تو چاند کا اجالا ہیں۔ وہ اجالا آپ کے ماتھے پر کیوں چمک اٹھا۔ آپ کے لئے کوئی کالی کلوٹی موزوں ہوتی ــــ!" اس نے کہا۔

"شریر کہیں کا!" اسلم کے قہقہے ابلتے رہے۔ دیبا سر جھکائے کھڑی رہی

یہ تھی دیبا اور شہاب کی پہلی ملاقات۔ شہاب اسلم کا چچا زاد بھائی تھا۔ ان کا مشترکہ گھرانہ تھا۔ شہاب کے باپ کے انتقال کے بعد اسلم نے اسے اپنے بیٹے کی طرح پالا۔ وہ بچپن ہی سے چلبلا تھا۔ سارا دن چھوٹی سی بندوق اٹھائے چڑیوں کا شکار کرتا پھرتا۔ بچپن کی اس عادت نے جوانی میں اسے ایک اچھا کیپٹن بنا دیا تھا۔ کبھی چھٹیوں میں وہ گھر آجاتا تو قیامت آجاتی۔ بچے بوڑھے سبھی اس سے پناہ مانگتے۔ اس کی نت نئی عادتیں لوگوں کو بے حد بھاتی تھیں۔ جب تک وہ رہتا گھر کے سارے افراد سمجھتے میدان جنگ کے سارے بم یہیں پھٹ پڑے ہیں۔ شہاب سارے گھر کیلئے ہنسی کا طوفان اپنے ساتھ لاتا۔ اسلم کی شادی میں وہ شریک نہ ہو سکا تھا۔ اس زمانے میں وہ نیفا کی سرحدوں پہ اپنے ملک کا محافظ بنا کھڑا تھا۔ اب ایک سال بعد اسے چھٹی ملی۔ اور وہ گھر والوں سے ملنے آگیا۔

دیبا اپنے کمرہ میں بیٹھی اسی کے بارے میں سوچ رہی تھی کہ وہ دبے پاؤں اندر چلا آیا۔

آنکھوں میں نمی سی ہے چپ چاپ سے بیٹھے ہیں
نازک سی نگاہوں میں نازک سا فسانہ ہے

اس نے آتے ہی یہ شعر پڑھا۔

"اوہ تم ——— آؤ شہاب!" گالوں کو چومتی ہوئی شرمیلی مسکراہٹ کو چھپا کر دیبا نے کہا۔

بن گئی ناگ کالی گھٹا
زلف کو جب سنوارا گیا

شہاب نے دیبا کی زلفوں کو دیکھ کر کہا۔

"کہو کیا بات ہے؟" دیبا نے سوال کیا۔

تم مخاطب بھی ہو قریب بھی ہو
تم کو دیکھیں کہ تم سے بات کریں

شہاب شاعری کے موڈ میں تھا۔

"معلوم ہوتا ہے تمہیں شاعری سے بھی دلچسپی ہے!" دیبا کے موتی جیسے دانت چمک اٹھے۔

"ہاں بھابی! کوئی حسین شئے جب سامنے آجاتی ہے تو شاعر اپنے تصور کو اشعار کا جامہ پہناتا ہے۔ مصور رنگوں سے قوس قزح بنانے بیٹھ جاتا ہے۔ قلم کار کاغذ کے صفحے سیاہ کر دیتا ہے۔ اور ایک عام انسان صرف دیکھتا ہے۔ قدرت کی صناعی کی دل ہی دل میں داد دیتا ہے۔ لیکن میں نے اشعار کا

سہارا لیا ہے۔ پتہ نہیں کیا بات ہے آپ کو دیکھ کر بار بار شعر کہنے کو جی چاہتا ہے ـــــ" شہاب نے کہا۔

"اچھا یہ تو بتاؤ تم کتنے دن کی چھٹی پر آئے ہو۔"

"آپ کہیں تو عمر بھر کی لے لوں!" وہ اس کی آنکھوں میں گھورتے ہوئے بولا۔

دیبا جھینپ گئی۔

"اچھا یہ تو بتایئے آپ کہاں پیدا ہوئیں؟" شہاب نے غیر متوقع سوال کیا

"دلی میں ـــ کیوں ـــ؟" اس نے پوچھا۔

"آپ غلط کہہ رہی ہیں۔ دلی میں اور حسن کا ایسا نمونہ ـــ! ناممکن یہ جو آپ کی آنکھیں ہیں نا! ایسی معلوم ہوتی ہیں جیسے بجلی سے تڑپ اور ستاروں سے چمک مانگ لائی ہیں۔ زلفوں میں گھٹاؤں کی سیاہی سمٹ آئی ہے۔ ابرو ہلال کو شرمندہ کرتے ہیں۔ ہونٹوں کی دلکشی میں نہ جانے کتنے پھولوں کا رس سمویا ہوا ہے۔ گردن شاخِ گل کی طرح جھکی ہوئی۔ پلکوں کی چلمن سورج کی کرنوں کو شرمندہ کرتی ہے۔ ماتھے پر چمکتے ہوئے پسینہ کے قطرے شبنم کی طرح ٹپکنے کو تیار ہیں آنکھوں میں سمندر جیسی گہرائی ہے۔ ان تیز نظروں کی تاب کوئی نہیں لا سکتا۔ پھر بھلا آپ دلی کی رہنے والی کیسے ہوئیں؟ آپ تو آسمانی شاہکار ہیں۔" شہاب نے بے جھجک کہہ دیا۔

"تم بہت باتونی ہو!" دیبا اٹھ کر اندر چلی گئی۔

اس کے کانوں میں بہت دیر تک شہاب کے جملے گونجتے رہے۔ وہ سوچنے لگی اس نے ایسا کیوں کہا ـــ؟ ان باتوں کا مطلب کیا ہے؟ کہیں وہ مجھ سے محبت تو نہیں کرتا ـــ؟ نہیں نہیں وہ ایسا نہیں کر سکتا۔ میں اس کی بھابی ہوں

میں اسلم کی ہوں۔ اسلم کا بڑھاپا مجھے ان سے دور نہیں کر سکتا۔ ان کے بچے میرے بچے ہیں۔ بیجی نے مجھے اسلم سے بیاہ دیا۔ ہو سکتا ہے میری قسمت میں ان ہی کا ساتھ ہو گا۔ میں اسلم کی ہوں، اس دیوتا کی جس کے قدموں میں مجھے پیار کے انمول موتی ملے۔ اس کا سر اسلم کی تصویر کے آگے جھک گیا۔

"اسلم میرے دیوتا!"

"اچھا تو پوجا ہو رہی ہے بھیا کی ___ ؟" شہاب کی آواز آئی۔

"نہیں تو ___" دیبا نے آنچل کو لپیٹ کر کہا۔

"دیبا بھابی! ایک بات کہوں، برا تو نہ مانیے گا؟" شہاب نے کہا

"کہو ___" دیبا کرسی پر بیٹھ کر بولی۔

"مجھے آپ عام عورتوں سے الگ نظر آتی ہیں"

"وہ کیوں ___ ؟" اس نے حیرت سے سوال کیا۔

"اس لئے کہ آپ میں وہ عام باتیں نہیں، جو عام عورتوں میں ہوتی ہیں!"

"عام باتیں کیا ہوتی ہیں شہاب ؟ تم تو پاگل ہو" دیبا ہنس پڑی۔

"دیبا بھابی آپ مجھے متضاد جذبوں کی حامل نظر آتی ہیں۔ کبھی آپ کی آنکھوں میں بے پناہ پیار ملتا ہے، کبھی کوئی تڑپ، کبھی کوئی پیاس، کبھی سنجیدگی، کبھی آپ کے انداز نوجوانوں کا سا نظر آتا ہے۔ کبھی آپ کو دیکھ کر ممتا کے جذبے کی تصدیق ہوتی ہے۔ بھیا آپ سے کافی بڑے ہیں۔ پھر آپ کے ننھے ننھے سوتیلے بچے بھی ہیں۔ مجھے نہیں پتا کہ آپ جیسی لڑکی اس گھر کی بہو کیسے بن گئی؟ بھیا نے بچوں کی خاطر شادی کی۔ مگر آپ کے سرپرستوں نے بھیا سے آپ کو کیسے بیاہ دیا۔ میں دیکھتا ہوں صبح سے شام تک آپ گھر والوں کو پیار بانٹتی ہیں۔ محبت کے تحفے دیتی ہیں، خلوص کے پھولوں سے سب کے

دامن بھرتی ہیں۔ اس کے بدلے آپ کو کیا ملتا ہے ؟ کچھ نہیں۔ آپ کی عمر تو ابھی اٹھکھیلیوں کی تھی۔ لیکن اس عمر میں آپ کی سنجیدگی مجھے بھی خوفزدہ کر دیتی ہے۔" شہاب جیسے گہرائی میں ڈوب کر کہہ رہا تھا۔

"بدھو کہیں کے! اتنی سی بات نہیں سمجھ سکے؟ میں گھر میں سب سے بڑی ہوں۔ تمہارے بھیا اس گھر کے ذمہ دار فرد ہیں۔ میں ان کی شریک زندگی ہوں۔ میرا فرض یہی تو ہے کہ ہر قدم ان کے قدم سے ملا کر چلوں۔" دیبا نے کہا۔

"نہیں بھابی! آپ خود کو دھوکا دے رہی ہیں۔ آپ نے حالات سے سمجھوتہ کر لیا۔ ورنہ آپ کے سن و سال کی کوئی عورت ایسے ماحول میں اتنی خوش نہیں رہ سکتی۔"

"تمہارا خیال غلط ہے شہاب! خوشی کا جذبہ صرف ماحول سے پیدا نہیں ہوتا یہ وہ جذبہ ہے جو ہر لمحہ، ہر پل ہمارے دل میں دھڑکتا رہتا ہے۔ اور موقع کا متلاشی ہوتا ہے۔ محبت سن و سال اور شکل و صورت کی محتاج نہیں ہوتی۔ پیار کا دھارا کسی کے دامن میں بھی گر سکتا ہے۔ کوئی بھی اس امرت کو پی سکتا ہے شرط صرف ظرف کی ہے تم سمجھتے ہو میں اپنی زندگی سے خوش نہیں۔ یہ تمہارا خیال ہے۔ اس جگہ آ کر تو میں نے جینا سیکھا۔ بھلا جہاں زندگی ملتی ہے اس در پر آ کر کوئی سوالی ناامید اور مایوس بھی رہتا ہے۔ اسلم مجھ سے پیار کرتے ہیں۔ یہی میرے لئے سب کچھ ہے۔ میرے سارے جذبات ان کی محبت ہی کے محور پر گردش کرتے ہیں۔" دیبا نے سنجیدگی سے کہا۔

"محبت کا جذبہ تو ہر انسان کے دل میں ہوتا ہے۔ دیکھیں گے ہمارا جذبہ ہمیں کس محور پر لے جائے گا۔" شہاب اتنا کہہ کر چلا گیا۔

" دیبا دن رات شہاب کی باتوں سے الجھی رہنے لگی۔ اس کے خیالات کے سمندر میں طوفان بپا تھا۔ یہ سچ تھا کہ اس نے حالات سے سمجھوتہ کر لیا۔ وقت کو مرہم جانا۔ اسلم

کو محبت کے بدلے محبت دی۔ خدمت دی۔ اس کے بچوں پر اپنی ماتا کے پھول نچھاور کر دیئے زندگی کو وقت کے ساتھ چلنا سکھا دیا۔ مگر آج شہاب کی باتوں نے اس کے زخموں کو کرید دیا تھا۔ وہ سسک پڑی۔

آج صبح ہی سے پکنک پر جانے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ شہاب پیش پیش تھا بچے تیار ہو رہے تھے۔ پکوان کی چیزیں قرینے سے رکھی جا رہی تھیں۔ شہاب کو گھر سے نکلنے کی جلدی تھی۔ وہ سیدھے دیبا کے کمرہ میں چلا آیا۔ اسلم تیار ہو کر باہر نکل چکا تھا "ادہ بھابی پلیز جلدی کیجئے نا!" وہ اندر داخل ہو کر کہنے لگا۔ اور دوسرے ہی پل ٹھٹک کر رہ گیا۔ دیبا نارنجی رنگ کی ساری میں ملبوس تھی۔ وہ ہونٹوں پر لپ اسٹک لگا رہی تھی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے گلاب کی پنکھڑی شبنم سے بھیگ گئی ہو۔۔۔۔!

"آج شام سورج غروب نہ ہوگا۔ شہاب نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"وہ کیوں بھلا ـــــ؟" دیبا نے مڑ کر کہا۔

"اس کے شفق کی ساری سرخی تو آپ نے لے لی! پھر بھلا وہ شرمندہ نہ ہو جائے گا!" وہ بولا۔

"تم بہت شریر ہو!" وہ ہنس پڑی۔

"کاش میں اچھا بھی ہوتا۔" اس نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔

"کس نے کہا تم برے ہو۔ تم بہت اچھے ہو شہاب!" دیبا نے کہا۔

"شکریہ! زہے نصیب کہ ہم اچھوں میں شمار کئے جانے لگے۔ بھابی! سچ تو یہ ہے کہ میں بہت برا ہوں۔ آپ کی زبان سے آج یہ سن کر اچھا ہو گیا۔" اس نے بہت ہی دلآویز انداز میں کہا۔

"پاگل! ـــــ چلو چلیں" وہ باہر نکل پڑے۔

قدوائی کاٹیج کی رنگینیاں جوان قہقہوں سے اور زیادہ نکھر آئیں۔ اسلم، دیبا اور شہاب "ناشتہ اور کریم سے دل بہلاتے رہے دیبا کی جتنی تصویریں آسکتی تھیں، شہاب نے اپنے کیمرے سے لے لیں۔ وقت گزر گیا۔ شام ڈھلنے کو آئی اور یہ حسین قافلہ اپنی منزل پر واپس آگیا۔

دوسرے دن سویرے ہی اسلم کو دورہ پر جانا تھا۔ اور وہ کہہ رہا تھا آج نہ جائیگا۔ کیوں کہ دیبا کی سالگرہ تھی۔ دیبا نے اسے سمجھایا کہ ایک بار سالگرہ نہ ہوسکی تو کیا ہوا، وہ اپنے فرض سے کوتاہی نہ کرے فوراً بمبئی چلا جائے۔ اسلم بمشکل تمام تیار ہوا۔ دیبا سے رخصت ہوتے ہوئے اس نے دو آنسو اس کے ہاتھوں پر گرا دیئے اور کہا "دیبا! اس بار میں تحفہ میں دو آنسو دے رہا ہوں۔ لیکن تم انہیں آنسو نہ سمجھو۔ یہ پیار کے موتی ہیں۔ بمبئی سے واپس آتے ہوئے تمہارے لئے موتیوں کا خوبصورت نیکلس لیتا آؤں گا۔ تم مجھ سے ناراض تو نہیں ہو نا! تمہاری قسم دیبا! میں اتنا کم ظرف تو نہ تھا کہ اپنی خوشی کیلئے کسی حسین لڑکی سے بیاہ کرلوں۔ میں جانتا ہوں تمہارے سپنوں کا تاج محل مجھ سے ملنے کے بعد ٹوٹ کر گر گیا۔ دیبا! پتہ نہیں تمہارے چچا نے تم پر ظلم کیا ہے یا مجھ پر۔ بخدا میں نے تو ان معصوم بچوں کی خاطر شادی کی تھی، جو ماں کے پیار کو ترس رہے تھے۔ تمہارے چچا نے کہا تھا کہ ان کے گھر میں کوئی غریب لڑکی رہتی ہے۔ میں نے ہاں کہہ دی۔ اگر تمہیں دیکھ لیتا تو شاید کبھی تم پر ایسا ظلم نہ ہونے دیتا۔ دیبا! نہ جانے کیوں تمہیں دیکھ کر مجھے دکھ ہو رہا ہے"۔ اسلم کے ہونٹ لرز رہے تھے۔

"یہ آپ کو کیا ہو گیا ہے بیٹھے بٹھائے۔ میں کبھی حرف شکوہ زبان پر نہ لائی۔

پ نے پیار کے جو خزانے مجھ پہ لٹا دیئے ہیں۔ میں انہیں کیسے بھول سکتی ہوں۔ میں سچ
ہتی ہوں یہاں تو میں نے جینا سیکھا۔ آپ نے ایسا کیوں سوچا، ایسا کیوں سوچا؟"
وہ اسلم کے سینے سے لگ کر سسکنے لگی۔

اسلم رخصت ہو گیا۔

اسی شام شہاب نے ایک پیکٹ دیبا کے ہاتھ میں تھما دیا۔

"یہ لیجئے اسے پہن کر دکھلیئے ——" اس نے کہا

"یہ کیا ہے شہاب؟" دیبا نے کہا۔

"التجا! گذارش! التماس! درخواست! اور کچھ کہوں بھابی؟" وہ ہاتھ
جوڑ کر کہہ رہا تھا۔

دیبا نے پیکٹ کھولا۔ اس میں ایک ساڑی تھی، گہرے آسمانی رنگ کی۔
س پہ دور دور پہ ستارے چمک رہے تھے۔ دیبا نے ساڑھی باندھی بال سنوارے
ور باہر نکل آئی۔

"میں یہی دیکھنا چاہتا تھا کہ آسمان پہ چمکتے ستاروں کے درمیان یہ ماہتاب
یسے جگمگاتا ہے۔ اسی لئے میں نے اس چھوٹے آسمان پہ چھوٹے ستارے ٹنکوائے۔ لیکن اس
حقیقی چاند کے دامن پہ سج کر وہ اور بھی کھل گیا۔ زمین کے اس چاند کے آگے آسمان کا
اند اپنی آب و تاب کھو بیٹھے گا" شہاب نے کہا۔

"بناتے کیوں ہو شہاب مجھے ——" دیبا نے کہا۔

"میری باتوں پہ اعتماد کیجئے۔ میں مبالغہ نہیں کر رہا ہوں۔ میری زندگی میں آپ پہ
ہلی عورت ہیں جس نے مجھے اتنا متاثر کیا ہم ..... میں ..... آپ سے" شہاب
رک گیا۔

"کہو رک کیوں گئے ـــــ؟" دیبا نے کہا۔

"مجھے آپ سے محبت ہوگئی ہے۔" وہ بولا۔

"تو اس میں اتنا گھبرانے کی کیا بات ہے۔ بزدل! کہیں محبت بھی اس طرح خائف ہوتی ہے۔ میں بھی تم سے کہتی ہوں مجھے تم سے محبت ہے" دیبا نے مسکرا کر جواب دیا۔

"سچ ـــــ! آپ سچ کہہ رہی ہیں!" وہ بے قابو ہو گیا۔

"ارے سچ تو کہہ رہی ہوں - میں تمہاری بھابی ہوں نا!"

"میں اس محبت کی بات کر رہا ہوں جہاں حسن حاکم اور عشق محکوم ہو جاتا ہے" شہاب بولا۔

"یہ اپنا اپنا خیال ہے تم اپنے نظریہ پر قائم رہو اور میں اپنے اصولوں پر" دیبا آگے بڑھ گئی۔

شہاب کی چھٹیاں ختم ہو چکی تھیں - وہ جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ دیبا اس کے کمرہ میں پہونچی۔

"شہاب تم جا تو رہے ہو، لیکن خیریت کی اطلاع بھجواتے رہنا۔!"

"میری زندگی ہی کیا دیبا بھابی! جیوں یا مروں کسی کی بلا سے" ـــ

نہ جینے میں لذت نہ مرنے کی خواہش
خدا جانے کس موڑ پر زندگی ہے۔

"ایسی باتیں کیوں کرتے ہو شہاب! کیا تمہارا اپنا کوئی نہیں، ہم بھی تمہارے نہیں تھے؟" دیبا نے افسردگی سے سوال کیا۔

"میرا کوئی ہوتا تو زندگی کی سنسان راہوں پر تنہا نہ چلتا - خود کو موت کے شکنجوں میں نہ کھینچ دیتا - نہ ماں نہ باپ نہ کوئی بہن۔ اسلم بھیا میری زندگی کے ایمن

ہیں۔ انہوں نے ماں باپ کا پیار دیا۔ زندگی کی ہر خوشی مجھ پر لٹا دی۔ مگر میری زندگی کی تنہا راتیں گیلی لکڑی کی طرح سلگتی رہیں۔ اسلم بھیا کا میرے خون کے ایک ایک قطرے پر حق ہے۔ وہ جتنا چاہیں بہا سکتے ہیں۔ اپنا سب کچھ میں اسلم بھیا پر نثار کر سکتا ہوں۔ مگر جہاں تک میری اپنی زندگی کا سوال ہے وہ تو تنہا ہے کسی بیوہ کی مانگ کی طرح۔ کسی بنجر زمین کی طرح، کسی سوکھے چشمے کی طرح۔ کسی سے پہلی بار پیار مانگا تو صرف گھٹی ہوئی آرزو ہاتھ آئی۔" شہاب کا گلا رندھ گیا۔

"شہاب تمہارے جذبات کی میں قدر کرتی ہوں۔ تم مجھ سے جتنا چاہو پیار مانگو لٹا دوں گی تم پر۔ مگر میرے نظریات کو میرے اصولوں کو مجروح نہ ہونے دو۔ تمہاری انوکھی ضد کو میں کیا کروں۔ تم شادی کر لو شہاب! تمہاری تنہائی ختم ہو جائے گی۔" دیبا بولی۔

"دیبا بھابی! محبت کے جذبے بہت بلند ہوتے ہیں۔ جو شخص ان جذبوں کو چھو لیتا ہے، سب کچھ پا جاتا ہے۔ میں تو ایسا راہی ہوں جسے خود اپنی منزل کا پتہ معلوم نہیں۔ میں جا رہا ہوں۔ لیکن میری ہر سانس میرے دل کی ہر دھڑکن آپ کے حکم کی منتظر رہے گی۔ جس دن آپ نے مجھے پکارا آپ کی قسم! میدان جنگ کی گولیاں بھی مجھے نہ روک سکیں گی!" اتنا کہہ کر وہ گھر سے نکل گئے۔ دیبا ایک آہ بھر کر کرسی پر گر پڑی اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھیگ گئیں۔

شہاب کچھ ہی دیر بعد پھر لوٹ آیا۔ اس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ آنکھیں سرخ تھیں۔ اس کے ہاتھ میں ٹیلیگرام تھا۔

"تم واپس آگئے شہاب؟" دیبا نے پوچھا

"ایک بہت بڑی خبر آپ کے لئے لایا ہوں ——" اس کی آواز گھٹ گئی۔

"کیا بات ہے؟" جلد کہو۔ دیبا بے چین ہو گئی۔

"اسلم بھیا کار کے ایکسیڈنٹ میں اللہ کو پیارے ہوگئے۔" یہ کہہ کر شہاب رو پڑا۔

"نہیں ـــــ ایسا نہیں ہو سکتا۔" دیبا کی چیخ سے فضاء کانپ اٹھی۔ بچے اس کے گرد جمع ہوگئے۔

"بھابی! خدا نے بہت بڑی ناانصافی کی ہے آپ کے ساتھ ـــــ" شہاب دیبا کے قدموں میں لوٹ رہا تھا۔ دیبا پھٹی پھٹی آنکھوں سے چاروں طرف دیکھنے لگی۔ اس کے بعد وہ یک بہ یک گم سم ہوگئی۔ شہاب نے دیبا کو دیکھا وہ سکتہ کے عالم میں تھی۔ آنسو اس کے گالوں پر جم گئے تھے۔

"دیبا بھابی ـــــ!" شہاب چیخ اٹھا۔ بچوں کے رونے سے سارا ماحول لرز گیا۔ مگر دیبا پر کوئی اثر نہ ہوا۔ شہاب نے فون کر کے ڈاکٹر کو بلایا۔ ڈاکٹر نے دیبا کو دیکھا اور کہا۔

"اچانک صدمہ سے انہیں سکتہ ہو گیا ہے۔ ان کا ہوش میں آنا مشکل ہے۔ ہو سکتا ہے پھر کسی شاک سے یہ ہوش میں آسکیں۔

"کسی شاک سے؟ ڈاکٹر اس سے بڑھ کر صدمہ اور کیا ہوگا؟ ان کا سہاگ اجڑ گیا۔ محبت کے شاداب چمن پر بجلی گر گئی۔ پیار کا گلزار جل کر خاک ہو گیا۔ ان کی مانگ سونی ہو گئی۔ اس سے بڑھ کر بھی کوئی غم ہے ڈاکٹر؟" شہاب بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا۔ وہ دیبا کے قدموں میں پڑا رہا۔ شام بھی آئی رات بھی گزر گئی مگر اسی عالم میں بیٹھی رہی۔ شہاب نے نظر اٹھا کر دیکھا اور پھر کچھ سوچ کر وہ اپنی اٹیچی کھولنے لگا۔ دوسرے ہی لمحہ اس کے ہاتھ میں پستول تھا۔ اس نے دیبا کو غور سے

دیکھا۔ اور پھر پستول کا نشانہ اپنے دائیں بازو پر رکھ لیا۔ کچھ لمحوں بعد فضا میں گولی چلنے کی آواز آئی۔ اور اگلے ہی پل شہاب تڑپتا ہوا فرش پر تھا۔ گولی کے دھماکے سے دیبا چونک اٹھی۔ اس نے چاروں طرف دیکھا۔ شہاب پر نظر پڑتے ہی وہ چیخ اٹھی۔

"شہاب! یہ تمہیں کیا ہو گیا شہاب! آنکھیں کھولو!" وہ بلک کر رونے لگی۔ اسے اپنی کچھ سدھ نہ رہی۔ وہ شہاب کو لے کر ہسپتال پہنچی۔

"ڈاکٹر شہاب کو بچالو!" اس نے ڈاکٹر کے آگے ہاتھ پھیلا دیا۔

"میڈم! میں کوشش کروں گا۔ گولی تو نکل جائے گی۔ مگر خون کافی مقدار میں جا چکا ہے۔ ہمارے پاس بھی بلڈ بنک میں خون باقی نہیں رہا۔ اس لئے مشکل ہے!" ڈاکٹر نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"ڈاکٹر! میرا خون لے لو۔ اس کے کام آجائے گا۔ اسے بچالو!" اس نے روتے ہوئے کہا۔

"آپ خون دیں گی ——؟ لیکن اس وقت آپ خود کمزور ہوگئی ہیں۔" ڈاکٹر سوچ میں پڑ گیا۔

"نہیں ڈاکٹر! سوچو مت! میرا خون لے لو۔ میرے خون کا ایک ایک قطرہ اس کے لئے ماں کے دودھ کی قیمت رکھتا ہے۔ میرا خون اسے مل جائیگا تو یہ بچ جائے گا۔ ڈاکٹر! پلیز میری بات کو مت ٹالو۔ اسے ماں کی پکار سمجھو۔ یہ میرا بچہ ہے!" دیبا کی آواز گھٹتی چلی گئی۔

"آیئے میرے ساتھ!" ڈاکٹر نے دیبا کو اپنے ساتھ لے لیا۔

شہاب کا آپریشن کامیاب ہو چکا تھا۔ ہاسپٹل کے ایمرجنسی وارڈ میں شہاب اور دیبا الگ الگ پلنگوں پر لیٹے تھے۔ شہاب کی آنکھیں بند تھیں۔ خون کی بوندیں،

دیپا کے جسم سے نکل کر شہاب کی رگوں میں داخل ہو رہی تھیں۔ دیپا کے چہرے پہ پرسکون مسکراہٹ تھی۔ بالکل اسی وفادار سپاہی کی طرح جو اپنے ملک کو اپنی جان بھینٹ دے کر مسکراتا ہے۔ شہاب نے آنکھیں کھولیں۔

"بھابی! ـــــ تم کہاں ہو؟" اس نے پکارا۔

"مسٹر شہاب آپ آرام کیجئے۔ آپ کی بھابی تو نہیں، ماں، وہاں لیٹی ہیں"۔ ڈاکٹر نے کہا۔

"میری ماں! یہ کیا کہہ رہے ہو ڈاکٹر؟ وہ تو کب کی اس دنیا سے جا چکیں۔ وہ کہاں سے آ گئیں!" شہاب نے بے دلی سے کہا۔

"ماں کے مرنے سے ممتا کے جذبے نہیں مر سکتے مسٹر شہاب! وہ دیکھئے بھابی کے روپ میں آپ کی ماں اس پلنگ پر پڑی ہے۔ جس نے خود کو خطرہ میں ڈال کر آپ کو بچا لیا۔ آپ کی رگوں میں دوڑنے والا یہ خون اسی ماں کے دودھ کی قیمت رکھتا ہے" ڈاکٹر کی آواز بھر آگئی۔

"بھابی ـــــ!" شہاب پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیپا کو دیکھتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ دیپا کے پلنگ پر گر پڑا۔

"بھابی تم نے ایسا کیوں کیا؟ خود کو خطرہ میں ڈال کر مجھے کیوں زندگی دی تم نے؟ ایسا کیوں کیا ـــــ؟" وہ روتا رہا۔

"شہاب! یاد ہے تم نے ایک بار مجھ سے کہا تھا۔ محبت کے جذبے بہت بلند ہوتے ہیں۔ جو انہیں چھو لیتا ہے وہ سب کچھ پا لیتا ہے۔ آج میں نے انہیں جذبوں کو چھو لیا۔ زندگی میں بعض موڑ ایسے بھی آتے ہیں جہاں متضاد جذبے بیک وقت عمل کرتے ہیں۔ خوشیاں اور غم دل کے آنگن میں باہم رقص کرنے لگتے ہیں۔ قہقہوں کے طوفان میں سسکیوں کی بھی بازگشت

سنائی دیتی ہے۔ میں آج زندگی کے اسی موڑ پہ آگئی ہوں۔ جہاں مسکراہٹیں اور آہیں سانسں کے زیر و بم میں سما جاتی ہیں۔ جہاں پیار کی ٹھنڈک کے ساتھ دکھ کی ہلکی سی آنچ بھی ملتی ہے۔ مگر اس وقت زندگانی کا ہر گوشہ روشن ہو جاتا ہے۔ تم نے کہا تھا تمہیں مجھ سے محبت ہے۔ لو آج میں نے اس کا حساب چکا دیا۔ میں بھی تم سے محبت کرتی ہوں۔ تمہیں اس کی بلندیاں دکھانا چاہتی ہوں۔ شہاب! محبت کو محدود نہ سمجھو۔ اس میں کائنات کی سی وسعت ہوتی ہے۔ آسمانوں کی سی رفعت ہوتی ہے۔ محبت کا ہر جذبہ قابل پرستش ہے۔ خواہ وہ بیوی سے تعلق رکھے۔ بہن سے ماں سے بھائی سے دوست سے یا کسی سے۔ جن جذبوں میں صداقت اور پاکیزگی ہوتی ہے وہی اعلیٰ و ارفع ہوتے ہیں۔ یوں سمجھو شہاب کہ ایک چراغ رہ گزر نے تمہارے راستوں میں اجالے بچھا دیئے۔ اب ان اجالوں کے سہارے زندگی کی کٹھن منزلوں سے گزر جاؤ! ماما دیبا کی آنکھیں ساون بھادوں کی طرح برس رہی تھیں۔

دد بھابی ———! تم بہت بلند ہو۔ میں نے تمہیں غلط سمجھا۔ للّٰہ میری نادانیوں کو بھول جاؤ۔ میں گنہگار ہوں! شہاب کی آنکھوں کے پیمانے چھلک پڑے۔

دد شہاب! تمہارے آنسو بڑے قیمتی ہیں۔ یہ میرے گلے کا ہار ہیں۔ تمہارے بھیا نے جاتے ہوئے مجھ سے کہا تھا کہ وہ بمبئی سے میرے لئے موتیوں کا ہار لائیں گے۔ آج تم نے مجھے موتیوں کا وہ ہار پہنا دیا۔ جو شفاف ہوتے ہیں۔ جن پہ کوئی دھبہ نہیں ہوتا اپنے آنسوؤں کے ان موتیوں کو ضائع نہ کرو۔ ورنہ میرا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا۔ میرے چار بچوں کے اب تم ہی محافظ ہو۔ خدارا جلد اچھے ہو جاؤ! انہیں سنبھالو۔ وہ معصوم تمہاری انگلی تھامنے کو بے چین ہیں۔ ماضی پھر ایک بار تمہارے سامنے آرہا ہے۔ تم نے ان کے سرپرست کی انگلی تھامی تھی۔ آج وہ تمہاری سرپرستی میں

میں آرہے ہیں۔ انہیں سنبھال لو!" دیبا نے کہا۔ "ایک بدنصیب دکھیاری ماں کی یہ التجا مان لو شہاب!"

"ماں ــــــ!!" شہاب اپنے جذبات کی پوری قوت سے چیخ پڑا۔ اس کی اس آواز پر کائنات کا ذرّہ ذرّہ تڑپ اٹھا!!

(ماہنامہ بیسویں صدی دہلی دسمبر ۱۹۷۰ء)

شام جو ڈوب گئی

عثمانیہ ہاسٹل کے زینے اترتے ہوئے میں نے سوچا اس وقت شام کے چھ بجے ہیں۔ ظفر نے مجھے زمرد محل آنے کیلئے کہا ہے۔ دن مجھے سویرے سے پریشان کئے جا رہا تھا کہ میں اس کے ساتھ فرسٹ شو دیکھوں۔ مگر یہاں آصف کی حالت دیکھ کر دل اداس سا ہو گیا۔ اس کی شادی ہوئے مشکل سے چھ ماہ گزرے اور وہ کار کے ایکسیڈنٹ میں اپنے پاؤں کھو بیٹھا۔ اف —— نکہت کی آنکھوں سے بہتے ہوئے آبشار نے مجھے کئی بار ڈوبنے پر مجبور کر دیا۔ دلاسا دینے کی کتنی کوشش کرتا رہا مگر میں خود اس منزل پر آکر جیسے رک گیا۔ صبر و ضبط کی طاقت باقی نہ رہی۔ آصف نے کتنی اداس اداس آنکھوں سے مجھے دیکھا۔ اور کہہ اٹھا۔ ماجد! تم سچ سچ ہی کہتے تھے ہر خوشی کے پیچھے ایک غم ضرور ہے۔ فرق صرف فاصلے کا ہے۔ کبھی یہ طویل ہوتے ہیں اور کبھی باقی بھی نہیں رہتے۔ میں گہری سانس لیتے ہوئے زندگی کے اس خطرناک کھیل کو دیکھ رہا تھا۔ میرے کہے ہوئے الفاظ میرے ہی کانوں میں سیسے کی طرح پگھل رہے تھے۔ وقت کب ختم ہوا اس کا مجھے پتہ ہی نہ چلا۔ میں!

اس وقت چونک گیا جب نکہت نے میرا شانہ ہلا کر کہا! ماجد بھائی وقت ہو چکا ہے۔ چلیئے۔

"اوں ——" میں جیسے خواب سے جاگا۔ آصف کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر کچھ دیر ٹھہرا۔ پھر میں نے اسے آنکھوں سے لگا یا۔ یہ اس کے ہاتھوں کا پسینہ تھا یا میرے اندر سلگتے ہوئے جذبات کا دھارا۔ جو پھوٹ کر نکلا اور ہاتھوں کو گیلا کر گیا۔

"ماجد! تمہاری آنکھوں میں بادلوں کا سایہ کیسے چھانے لگا؟ تم تو ان میں بجلی کی چمک رکھتے تھے۔ تم تو کہا کرتے تھے آصف! زندگی سیل حوادث ہی ہے اس کا مقابلہ آہوں سے نہیں مسکراہٹوں سے کرو۔ آنسوؤں کے سمندر میں خس و خاشاک کی طرح بہہ جاؤ گے، تو اپنی ہستی کو مٹا دو گے۔ پھر تم آج اپنے قول سے کیسے پھر گئے دوست؟ آصف کی درد میں ڈوبی آواز ابھری۔

"میں کل پھر آؤں گا ——" اس کی بات کا میں نے مہمل سا جواب دیا اور باہر نکل آیا۔ اس ڈر سے کہ میرے آنسو کہیں اس کی ہمت پست نہ کر دیں۔ یہ سراسر ظلم ہی تو تھا اس پر! مزاج پرسی کیلئے جاکر اس کی حالت پہ اظہار تاسف کرنے کا مجھے کیا اختیار —— بھلے ہی مجھے دکھ ہوا ہو۔ لیکن ضروری نہیں کہ اس کے اظہار کیلئے آنسوؤں کا سہارا لیا جائے۔ میں دوا خانے کے زینے اترتے ہوئے سوچنے لگا! یہ زندگی —— چند لمحوں کی زندگی کتنی پُر فریب اور کتنی تنگ نظر ہے۔ پل بھر میں مسکان دیتی ہے تو پل بھر میں آنسو! کل تک آصف اور نکہت کے چہروں پر بہار کا جوبن تھا۔ اور آج ان کے چہرے خزاں رسیدہ شجر کی طرح لرز رہے تھے۔ ہونہہ —— میں نے گردن جھٹک دی۔ قریب سے گزرتی ہوئی ایک نرس نے مجھے غور سے دیکھا۔ میں

سنبھل گیا اور تیز قدموں سے آگے بڑھ گیا۔

یہ میرا معمول تھا کہ میں آصف کو دیکھنے کیلئے روزانہ عثمانیہ ہاسپٹل کے زینے چڑھتا اور اترتا۔ جیسے میری زندگی کے دو ہی کام تھے۔ اوپر جانا اور نیچے آنا۔ وہاں جاکر میں اس کے قریب خاموش بیٹھتا۔ وہ نہ جانے کیا کیا کہتا۔ میرا ذہن برف کی سل کی طرح جما ہوا رہتا۔ وقت ختم ہوتا تو میں اس کے ہاتھوں کو گرم جوشی سے دبا دیتا۔ اور نکل جاتا۔ آصف میرا بہت ہی قریبی دوست تھا۔ نکہت اسی کی [illegible] بہن تھی۔ ان دونوں کی محبت میری ہی کوششوں سے کامیاب ہوئی تھی۔ ان کی شادی کے شادیانے میں نے خوب خوشیاں منائی تھیں۔ کیونکہ مجھے اس بات کا فخر تھا کہ میں بھی کسی کے کام آسکا۔ ورنہ زندگی کے ۳۰ سال میں نے صرف آنسو ہی پیئے۔ نہ کسی کو سکھ دے سکا نہ کسی کے سکھ کو اپنا سکا۔ ماں نے جوان بہن کا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے کر ملک عدم کی راہ لی۔ اپنا ایک ایک زیور بیچ کر اس نے مجھے ایم اے کرایا تاکہ میں کوئی بڑا آدمی بن سکوں۔ مگر میری ڈگری مجھے اعلیٰ عہدہ دلا سکی اور نہ پیٹ بھر کھانا دے سکی۔ اور میں وہی ایک ناکارہ انسان رہ گیا۔ جو کاغذ [illegible] کے صفحات پہ [illegible] خاکہ نگاری کرتا۔ اپنی تمناؤں کی دنیا میں کھویا رہنے والا اپنے گرد و پیش سے بے خبر لاابالی انسان۔ بھلا وہ کیا جانے ذمہ داری کسے کہتے ہیں۔ ماں کی آنکھیں بند ہوتے ہی [illegible] ہوا کہ زندگی صرف خیالی دنیا کے سہارے آگے نہیں بڑھ سکتی۔ [illegible] تو بنا لیکن ضروریات زندگی کیلئے ناکافی رہا۔ نوکری کیلئے در در [illegible] ایک گودام میں پناہ لی۔

تاج کی عمر بڑھتی جا رہی تھی۔ ماں کو اس کے ہاتھ پیلے کرنے کی فکر تھی۔ [illegible] تو چہرے پیلے ہونے لگے۔ تاج نے کبھی احساس نہ دلایا کہ وہ [illegible]

نہ میں نے اس کے چہرہ کی ابھرتی ہوئی ہڈیوں کا جائیزہ لیا۔ مجھے اتنی فرصت ہی کہاں تھی۔ دن بھر ایک گو دام میں کھاتے لکھتا، جس کے عوض صرف پچاس روپئے مجھے ملتے شام کو چھٹکارہ ملتا تو گھر آکر ٹوٹی چارپائی پہ گر جاتا۔ پھر میں ہوتا اور میری کہانیاں۔ میں چاہتا تھا جلد سے جلد اپنے افسانوں کا مجموعہ مرتب کردوں۔ تاکہ کچھ روپئے مل جائیں۔ اور میں تاجی کے سر سہرا باندھ سکوں۔ وقت کا ایک ایک لمحہ مجھ پہ بھاری تھا۔

"شبو ـــــ جو میری جان تھی میرا ایمان تھی۔ میں نے اسے بھی چھوڑ دیا۔ مگر وہ مجھے چھوڑ نہ سکی۔ میری ہر کہانی میں اس کا روپ تو رہتا، میری ہر ہیروئن کے آنچل میں اس کا مکھڑا ہوتا۔ سچ تو یہ تھا کہ وہ مجھ سے دور جا بھی نہ سکی۔ اس نے آنسوؤں کے آخری پیالے کو تھام کر کہا تھا۔ "ماجد! میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی۔ تم مجھے اپنالو پتا سے روپے مانگ لو۔ تاجی کی شادی کردو۔ پھر ہم اور تم رہیں گے۔ پتا میری شادی کی جلدی کر رہے ہیں۔ خدا کیلئے تم ان سے روپے مانگ لو۔ اور جہاں تک ہو سکے جلد تاجی کی شادی کردو۔"

"اچھا! تو تم یہ چاہتی ہو کہ تمہارے پتا کی دی ہوئی بھیک سے میں تاجی کا گھر بساؤں۔ نہیں شبو! چاندی کے کھنکتے ہوئے سکے مجھے خرید نہ سکیں گے۔ تم مجھے قابل رحم سمجھتی ہو۔ میری غربت کا مذاق اڑاتی ہو۔ تم مجھے نہیں جانتیں۔ ماجد بھوکا رہا مگر کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلائے۔ ماں کی تدفین کیلئے اپنے باپ کی آخری نشانی ان کی گھڑی میں نے بیچ دی۔ مگر کسی ساہوکار سے پیسے نہیں لئے۔ میں ہار ماننے والوں میں سے نہیں ہوں شبو! یہ تاریک رات کبھی نہ کبھی سحر میں بدلے گی۔ اگر واقعی تمہیں مجھ سے پیار ہے تو میرا انتظار کر۔ دیکھ چاہے تمہاری جوانی تمہارا ساتھ چھوڑ دے۔ وہ نہ ـــــ

تم کسی کی بھی زندگی کو رشکِ ارم بنا سکتی ہو۔ میرے یہ الفاظ سننے کے بعد اس کے ہاتھوں میں کانپتا ہوا آنسوؤں کا پیالہ چھوٹ گیا۔ پانی کی کئی بوندیں ایک ساتھ میرے پیروں پہ گر پڑیں۔ میں سر جھکا کھڑا تھا جیسے احساس ہی باقی نہ ہو۔ میں نے جان بوجھ کر شبو کو چھوڑ دیا۔ صرف یہی ایک چارہ تھا میرے لئے۔ کچھ دیر تک فضا میں سسکیوں کی گونج رہی۔ اس کے بعد شبو میرے قدموں کی طرف جھک گئی اس نے دوپٹے کے آنچل سے میرے پیروں پہ گرے ہوئے آنسوؤں کو پونچھ ڈالا۔ اور دھیرے سے کہا۔

"پیار کے یہ موتی تم قبول نہ کر سکے۔ یہ میری بدنصیبی ہے۔ اپنا اثاثہ لئے جا رہی ہوں کہیں تمہیں انہیں لوٹانے کیلئے بھٹکنا نہ پڑے۔

"اف!" میرے دل سے ایک سرد آہ نکلی۔ آنکھ سے دو آنسو ٹپکے اور شبو کے بالوں میں جذب ہو گئے۔ شبو! میری جان! میں اپنی ساری زندگی کی عبادت تمہیں دے رہا ہوں۔ میرے دل سے آواز آئی۔ مگر لب ہل نہ سکے۔ شبو نے مجھے دیکھا نہیں۔ وہ تیزی سے کمرہ سے نکل گئی۔ اور میں دروازہ کی طرف دیکھتا کھڑا رہا جیسے کسی نے میری ساری قوت چھین لی ہو۔ اور میں پتھر کا ایک مجسمہ ہوں۔

وہ کتنی ہولناک صبح تھی جب تاجی بستر پہ مردہ پائی گئی۔ اس کے سرہانے ایک خط تھا جس میں اس نے میری اور شبو کی جدائی کا ذمہ دار خود کو لکھا۔ اور مجھ سے دور چلی گئی۔ میں نے تاجی کے چہرہ پہ نظر کی تو مجھے احساس ہوا کہ ماں نے مجھے اس کے ہاتھ پیلے کرنے کیلئے کہا تھا۔ مگر میں نے تو اس کا چہرہ پیلا کر دیا تھا۔

تاجی کی موت نے مجھے جھنجوڑ دیا۔ میں بھی بہت سخت جان تھا۔ جو اتنے آفتوں پہ بھی زندہ رہا۔ نہ پاگل ہوا نہ موت آئی۔ شبو پرائی ہو چکی تھی۔ اس کی شادی

میں بھی شریک نہ ہوا۔ لیکن شہنائیوں کی آواز برابر سنتا رہا۔ تاجی مر چکی تھی اس کے جنازہ کو میں نے کاندھا دیا۔ اور پھر بھی زندہ رہا۔ وقت کا ستم سہنے اور زندگی کا زہر پینے کیلئے۔

کئی دن تک مجھ پہ بے ہوشی طاری رہی۔ اس دوران آصف میرا مونس وغم خوار رہا۔ اس نے مجھے اپنے ہی گھر میں رکھا۔ انہوں سے بڑھ کر پیار دیا۔ اس کی محبت نے بہت حد تک میرے زخموں کو مندمل کیا۔ اور پھر ایک جھگمگاتی رات کو آصف نے میرے ہاتھ میں قلم تھما دیا اور کہا ـــــ

" ماجد لکھو ـــــ اور ایسا لکھو کہ پتھر بھی رو اُٹھے۔ تمہارا قلم دکھ کی سیاہی میں ڈبویا ہوا ہے۔ فن کو نکھار اسی وقت آتا ہے جب اس میں خون جگر کی آمیزش ہو۔ تم بہت بڑے فنکار ہو۔ یاد رکھو قدرت کا یہ تحفہ تمہیں اوروں پر لٹانے کیلئے دیا گیا ہے۔ یاد رکھو اگر اس جذبے کو دل میں دفن کرو گے تو گھٹ کر رہ جاؤ گے۔ دوسروں کی بھی حق تلفی کرو گے۔ اور پھر میرے قلم نے نہ جانے کیسی اڑان لگا دی ـــــ میں لکھتا ہی گیا۔ کئی افسانے چھپ چکے۔ کئی ناول شائع ہو چکے۔ ناولوں کا انتساب میں نے اپنی زندہ موت کے نام سے کیا۔ تاجی کے زرد چہرے کے نام سے بھی اور شبو کے نام بھی ـــــ لیکن بھولے سے اسے بدنام نہ کیا۔ کبھی اس کی زلفوں میں بادل گوندھے تو کبھی مرمژگاں آنسوؤں کے چراغ جلائے کبھی گالوں کی کلیاں چٹکائیں کبھی تبسم کا گلدستہ بنایا۔ کبھی آنکھوں کی گہرائی کے نام لکھا تو کبھی ان لبوں کے نام جو سکوت کے باوجود افسانے رکھتے ہیں۔ میری زندگی سوا ایک لمحہ لکھنے کی نذر ہو گیا۔ ملک کا بچہ بچہ مجھ سے واقف تھا۔ لوگ مجھ سے اپنے دل دھڑکا درماں چاہتے تھے۔

میں ـــــ جو خود بیمارِ غم تھا کہاں کی چارہ سازی کر سکتا۔ جس کا اپنا پیرہن تار تار ہو وہ دوسروں کے لباس کی رفوگری کیسے کرے۔ میرے افسانے میرے غم کا مداوا ہوتے۔ اپنے احساسات کو الفاظ کا جامہ پہنا کر اپنے دل کو مطمئن کرنا ہی اب میری زندگی کا مقصد تھا۔ آصف نے میری ہر طرح سے مدد کی۔ جب مجھے پتہ چلا کہ وہ نکہت کے بغیر اپنی زندگی کو بے معنی سمجھتا ہے تو میں نے اپنی تمام ترکوششوں سے انہیں ازدواجی زندگی کے بندھنوں میں باندھ دیا۔ اس کے بعد تو جیسے میں ان کا مسیحا ہو گیا۔ وہ دونوں میری دیکھ بھال یوں کرتے تھے جیسے میں کوئی ننھا سا بچہ ہوں۔ اور دنیا کی بھیڑ میں کھو جانے کا ڈر رہو۔

آصف کے اس اچانک حادثے نے میرے ذہن کو ماؤف کر دیا۔ نکہت کی آنسوؤں سے لبریز آنکھیں مجھے گھٹ جانے پر مجبور کرتیں۔ میں اسے کیا تسلی دے سکتا۔ جبکہ میں خود قابلِ رحم تھا۔ کتنے سارے غم ملنے کے بعد آصف جیسے دوست نے زندگی کو جو تھوڑی سی پیار بخشی تھی۔ وہ بھی وقت کی بے ثباتی کا شکار ہو گئی۔ اتنی محنتوں سے میں نے انہیں خوشیاں دلائیں اور وہ بھی اپنے پیچھے غم کا ایک دریا لئے ساتھ چلی آئیں۔ ـــــ یا اللہ! کیا میری مسیحائی بھی صرف دو پل کی رہی؟ کیسے کھیل کود نیا میں خوشی بھی ہوتی ہے۔ بس میں اتنا جانتا ہوں کہ خوشی غم ہی کا ایک روپ ہے۔

دن گزرتے رہے۔ وقت گزرتا ہی رہا۔ دن اور رات کی سوئیاں گردش کرتی رہیں۔ پھر ایک ملگجی شام کو آصف بیساکھی سنبھالے آتا دکھائی دیا۔ میں اسے دیکھ کر دوڑ پڑا۔ وہ مجھ سے لپٹ گیا۔ بیساکھی اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ اس نے مجھے بھینچ لیا۔

"ماجد! میں تمہارے سہارے کھڑا ہونا چاہتا ہوں۔ مجھے تھام لو!" اس نے

میں نے اسے بھینچ لیا۔ میرا دل تیزی سے دھڑکتا ہوا اس بات کی گواہی دے رہا تھا کہ میں اپنی ساری زندگی آصف کیلئے وقف کر سکتا ہوں۔

میں اب اپنا زیادہ تر وقت آصف کے ساتھ گزارنے لگا۔ تاش سے کیرم سے اس کا جی بہلاتا۔ کبھی اپنی کہانیاں سناتا تو کبھی نغموں کا جادو جگاتا۔ میرا مقصد اسے خوش دیکھنا تھا۔ اور میں اس کے لئے ہر ممکن کوشش کر رہا تھا۔ سچ تو یہ تھا کہ اس کی یہ حالت دیکھ کر خود میرا جی رو اٹھتا۔ مگر میں نے اپنے آنسوؤں کو کبھی چھلکنے نہیں دیا۔ آصف کے گھر آجانے سے نکہت بہت شگفتہ نظر آنے لگی تھی۔ لیکن میں نے ایک بات محسوس کی وہ یہ کہ آصف اب کچھ کھویا کھویا سا رہنے لگا تھا بیٹھے بیٹھے ایک دم کھو جاتا۔ جیسے کہیں راہ میں چھوٹ گیا ہو۔

ایک دن ہم دونوں برآمدہ میں بیٹھے تھے۔ نکہت ہمارے درمیان بیٹھی چائے بنا رہی تھی۔ اس نے ایک پیالی آصف کے سامنے رکھ دی۔ اور دوسری مجھے دینے لگی۔ اتفاق کی بات کہ پیالی لیتے لیتے میرے ہاتھ پھسل گئے۔ اور گرم گرم چائے نکہت کے ہاتھوں پر گر پڑی۔ وہ سوزش کی وجہ سے "اف" کہہ کر رہ گئی میں نے جلدی سے رومال نکالا اور اس کے ہاتھ صاف کرنے لگا۔ اور وہ آنکھیں بند کئے بیٹھی رہی میں اس کے ہاتھ آہستہ آہستہ سہلاتا رہا۔ دفعتاً میں چونک گیا۔ اس کی ہتھیلی سے کچھ نیچے کی طرف ایک گہرا سیاہ تل تھا۔ میرے دماغ نے جست لگائی اور مجھے شبو کا ہاتھ یاد آگیا۔ بالکل اسی طرح نرم اور ملائم اور بالکل ویسا ہی تل۔ نہ جانے مجھے کیا ہو گیا۔ میں نے بے اختیار نکہت کا ہاتھ اپنی آنکھوں پر رکھ لیا۔ اور بے تابی سے اس تل کو چوم لیا۔

"ماجد!" آصف کی چیخ نے مجھے چونکا دیا میں نے آنکھیں کھولیں۔ نکہت حیران

سے پریشان تھی۔ آصف کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

"مم .... میں .... میں نے یہ کیا کیا!" میں بوکھلایا ہوا سا کہہ اٹھا۔

"تم اتنا گر سکتے ہو" یہ میں نے نہیں سوچا تھا۔" آصف کی آنکھیں ابل پڑیں

"آصف! مجھے غلط نہ سمجھو میرے دوست! میری بات تو ...." میں نے صفائی پیش کرنی چاہی۔

"بند کرو بکواس! تمہارے منہ سے! اتنا پاکیزہ لفظ گالی بن کر نکل رہا ہے مجھے صفائی کی ضرورت نہیں۔ تم میری مجبوری سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہو؟ میں نے تمہیں سہارا دیا" اپنا سمجھا۔ اور تم مجھے اپاہج سمجھ کر میرا ہی گھر لوٹنا چاہتے ہو؟ آصف برس پڑا۔

"آصف! ... خدا کیلئے ...." میں نے اس کے منہ پہ ہاتھ رکھتے ہوئے کچھ کہنا چاہا۔ مگر اس نے میرا ہاتھ ہٹا دیا۔

"کم ظرف! ــــــ دور ہو جاؤ میری نظروں سے۔ میں تمہاری صورت بھی دیکھنا نہیں چاہتا۔ اس نے میری بات کاٹ دی اور بیساکھی لے کر اندر چلا گیا۔ بیساکھی کی کھٹ کھٹ میرے دماغ پہ ہتھوڑے برساتی رہی۔

"یا اللہ! ــــ یہ کیسا مذاق ہے میرے ساتھ؟ کیا سارے ہی دکھ میرے لئے ہی رکھ چھوڑے ہیں تو نے ــــ؟" میرا سر چکرانے لگا۔ میں بہت دیر تک اسی کرسی پہ پڑا رہا۔ شام بھی آئی اور رات بھی آئی۔ سڑک سنسان اور ویران تھی۔ تاریکی کا گہرا راج تھا۔ میں آصف کے گھر سے نکل پڑا اور اندھیروں میں ڈوب گیا۔

بمبئی آنے کے کئی دنوں بعد مجھے ایک کالج میں ملازمت مل گئی۔ میں نے ایک چھوٹا سا

سا فلیٹ کرایہ پر لے لیا۔ میں افسانے اب بھی لکھتا۔ قارئین کے خطوط اس حقیقت کا احساس دلاتے تھے کہ اب میرے افسانوں میں درد کا عنصر اور زیادہ بڑھ گیا ہے اس کی وجہ کیا ہے میں خود بھی نہ سمجھ سکا۔

کالج کے ساتھی پروفیسر میری بہت عزت کرتے کیوں کہ میں ان کی نظر میں مشہور ادیب تھا اور ایک اچھا استاد بھی۔ طلباء کی ہمدردی اور چاہت بھی میرے حصے میں آئی تھی۔ مجھ سے پہلے جو لکچرر یہاں تھے ان کے اچانک چلے جانے کی وجہ یہ تھی کہ وہ ایک حادثہ میں اپنی آنکھیں گنوا چکے تھے۔ مجھے ان سے ہمدردی پیدا ہو گئی۔ انہیں دیکھنے کی بھی خواہش رہ رہ کر دل میں اٹھتی تھی۔ اتفاق ایسا ہوا کہ کالج کا سالانہ جلسہ منعقد ہو رہا تھا۔ بہت سی عظیم ہستیوں کو مدعو کیا گیا۔ پروفیسر حسن کو بھی دعوت نامہ بھیجا گیا۔ میں ان سے ملنے کا بہت مشتاق تھا۔ اس لئے کالج کے صدر دروازے پر کھڑا رہا۔ لوگ آتے رہے جاتے رہے۔ اسی وقت ایک سیاہ کار آگے آکر رکی۔ ایک خوبرو شخص نیچے اترا جس کی آنکھوں پر سیاہ چشمہ تھا۔ عمر بیالیس کے قریب ہو گی۔ اس کے پیچھے ایک خوبصورت سا ہاتھ نظر آیا۔ میں نے سوچا بھلا یہ کون ہوگا ـــــ دوسرے ہی پل میں ٹھٹک کر رہ گیا۔ یہ میری شبو تھی۔ میری جان، میرا ایمان ـــــ!!۔

وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے آگے بڑھی۔ اس شخص کے ہاتھ میں چھڑی تھی۔ وہ شبو کا بازو تھامے چل رہا تھا۔ میں شبو کو گھور رہا تھا۔ دفعتاً کسی نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔

"مسٹر ناہید! آپ پروفیسر حسن سے ملنے کے خواہش مند تھے۔ لیجئے وہ جان محفل آگئے۔ پروفیسر کاظمی مجھ سے کہہ رہے تھے۔

"ہیلو کاظمی!" پروفیسر حسن کی سحر کارانہ آواز آئی۔ "جان محفل کہاں رہے!"

اب تو بجھتا ہوا چراغ بن گئے ہیں۔

"ان سے ملو! یہ ہیں مسٹر ماجد! تمہاری جگہ آئے ہیں۔ یہ ہیں مسٹر حسن سابق پروفیسر۔ یہ ہیں ان کی مسز شبانہ حسن!" کانت نے ایک دوسرے سے ہمارا تعارف کروایا۔

"مسٹر ماجد! میں آپ کو دیکھ نہیں سکتا، محسوس کر سکتا ہوں۔ ایک حواس کے معطل ہونے سے فرق نہیں پڑتا۔ ابھی چار تو مجھ میں باقی ہیں۔ اور ایک حس کی کمی ہے وہ گوشت پوست میں ڈھلی ہوئی شبانہ ہیں یعنی میری بیوی۔" پروفیسر حسن نے مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

میں نے شبو کی طرف دیکھا اس کی آنکھوں کے کنارے جھلملا رہے تھے۔ ہلکی نیلی رنگ کی ساڑی میں اس کا چہرہ یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے فلک کا کوئی گوشہ چاند کو دامن میں لئے زمین پر اتر آیا ہے۔

"آداب!" اس نے اپنی انگلیاں جبین پر رکھ دیں۔

میں نے ہاتھ اٹھایا، لیکن کہاں تک پہنچا مجھے یاد نہیں۔ البتہ جب میں نے مصافحہ کیلئے ہاتھ بڑھایا تو وہ کچھ بوکھلا سی گئی۔ میں نے اپنی غلطی محسوس کی۔

"بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر، بہت دیر سے آپ کا منتظر تھا۔" میں صرف اتنا کہہ سکا۔

"زہے نصیب کہ اب ہمارا انتظار ہونے لگا۔ میں آپ کے جذبات کی قدر کرتا ہوں۔" پروفیسر حسن آگے بڑھ ہنستے ہوئے کہہ رہے تھے۔ "مسٹر ماجد! کہیں آپ وہی مصور الم الیاس ماجد تو نہیں جس نے "خزاں کے سائے" لکھی ہے؟" انہوں نے میری طرف گردن گھمائی۔ کاش وہ مجھے دیکھ سکتے۔

"جی ـــ" میں نے قدرے گردن کو خم کرتے ہوئے کہا۔

"واہ بھئی واہ! شبو! تم جن کی دیوانی ہو وہ یہیں مل گئے۔ اب تمہیں پاگل خانے تک بھیجنے کی ضرورت نہ پڑے گی۔ تمہارا ڈاکٹر تمہارے سامنے ہے۔ یہ ہماری شبو ہیں نا! بس آپ کے افسانوں کی رسیا ہیں۔ ہماری لائبریری چل کر دیکھئے آپ ہی آپ ہیں۔ یہ بھی خوب رہی صاحب ؎

جنھیں میں ڈھونڈتا تھا آسمانوں میں زمینوں میں
وہ نکلے میرے ظلمت خانۂ دل کے مکینوں میں

"کیوں! ہے نا شبو!" انہوں نے شبو سے پوچھا۔

"جی ـــ جی ہاں جی ہاں ـــ" شبو نے زبردستی گردن ہلا دی۔ میں دل مسوس کر رہ گیا۔ میرے سینے سے اٹھنے والی سرد آہ نے کہا۔ دیکھ! وہ تیری عبادت اب بھی کر رہی ہے۔!

یہ تھی میری اور حسن کی پہلی ملاقات۔ میں حسن سے بہت متاثر ہو چکا تھا۔ آدمی تھا ہی کچھ اتنا دلچسپ کہ چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا جیسے رومانی ناول کا کوئی رومانی حصہ ہو۔ قدرت کی ستم ظریفی نے اسے بینائی سے محروم کر دیا۔ میں نے اکثر شامیں ان کے ساتھ گزاریں۔ ایک دن حسن نے مجھ سے کہا۔

"مسٹر ماجد! یہ بھی اللہ کا کرم ہے کہ اس نے ہماری شبو کی جلوہ نمائی کے بعد ہمیں تاریکی دی۔ ورنہ ہم کہیں کے نہ رہتے۔ لیکن بھائی صاحب خوشیوں کی چھاؤں میں دکھ کی دھوپ کیوں چلی آتی ہے؟"

میں پھر ایک بار ماضی کی طرف لوٹ گیا۔ یہی سوال آصف نے مجھ سے کیا تھا! میں نے اپنی کہی ہوئی بات دہرا دی۔

"خوشی اور غم دو الگ الگ چیزیں نہیں۔ یہ تو غم ہی ہے جو پل بھر کیلئے خوشی کا روپ دھار لیتا ہے۔ جیسے .... جیسے تیز دھوپ کے وقت ابر چھا جائے تو ہلکی سی چھاؤں آ جاتی ہے۔ پھر جیسے ہی بادل کا یہ ٹکڑا ہٹ جاتا ہے وہی دھوپ پھر پھیل جاتی ہے۔

اس شام میں شبو ہی کے پاس بیٹھا تھا۔ وہ ایک خوشگوار شام تھی۔ ہوا کے سرد جھونکے جسم کو گدگدا رہے تھے۔ پروفیسر حسن اپنے کمرہ میں تھے۔ میں اور شبو تاش کھیل رہے تھے۔ دفعتاً اس نے تاش رکھ دیئے اور مجھے غور سے دیکھا۔

"کیا دیکھ رہی ہو ——" میں نے اسے گھورتے ہوئے دیکھ کر پوچھا۔

"یہی کہ زندگی کس کھیل کا نام ہے ——؟" اس نے کہا۔

"ایسے کھیل کا جس میں ہار کر بھی جیت ہوتی ہے!" میں نے خلاء میں گھورتے ہوئے کہا۔

"وہ کیسے ——؟" اس نے پوچھا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں میری یادوں کے سائے رینگ رہے تھے۔ اس کے خاموش لبوں پہ میرے ہی نام کا ورد تھا۔ اس کے سرخ گالوں پہ میرے ہی خون تمنا کا عکس تھا۔ میں کچھ دیر اسے دیکھتا رہا۔ پھر مسکرا کر چپ ہو گیا۔

"کہو نا ——!" اس نے ٹوکا دیا۔

"پھر کبھی کہوں گا" میں نے بات کا رخ بدل دیا۔

"ماجد! ایک بات بتاؤ۔ خوشیوں کی آخری حد میں تو آنسو آ جاتے ہیں۔ مگر غم کی آخری حد کون سی ہوتی ہے؟ یہ مجھے بتا دو۔ ورنہ کہہ دو غم کی کوئی منزل ہی نہیں!" شبو نے ڈوبے لہجہ میں کہا۔

شبو! غم کی آخری منزل وہ ہوتی ہے جہاں آنسو خشک ہو جاتے ہیں دل ٹوٹ ٹوٹ کر پامال ہو جاتا ہے۔ پھر بھی دھڑکتا ہے۔ اس کے ٹوٹنے کی آواز کسی کو سنائی نہیں دیتی۔ وہ بھی سسکتا ہے مگر اس کی سسکیاں فضا کو مرتعش نہیں کرتیں۔ زندگی کا سارا حسن مٹ جاتا ہے مگر نبض کی حرکت باقی رہتی ہے۔ آنکھوں کے چشمے سوکھ جاتے ہیں۔ لبوں کی آہیں ختم جاتی ہیں۔ رخساروں کی آنچ راکھ بن جاتی ہے۔ اور وہ پھر بھی جیتا ہے۔ غم کی آخری حد کو چھو کر بھی جیسے۔۔۔ جیسے میں جی رہا ہوں۔" میرے منہ سے غیر ارادی طور پر نکل گیا۔

"ماجد! تم ہی نے مجھے چھوڑ دیا۔ میں نے لب سی لیے۔ قدرت نے بہاروں سے میرا دامن سجایا مگر خزاں کا سایہ میرا پیچھا چھوڑ نہ سکا۔ میرے نصیب میں تمہارا ساتھ نہ تھا۔ حسن میرے ہم سفر تھے۔ اور تقدیر کے ناگ نے انہیں ایسا ڈسا کہ وہ سیاہ رات کی باہوں میں سمٹے چلے گئے۔ میرا مقدر اندھیروں میں بھٹک رہا ہے۔ مجھے بچا لو ماجد! میں آج بھی تمہاری ہوں۔ ـــــ مجھے تھام لو۔ خدا کیلئے کہیں لے چلو ـــــ!" شبو میرے سینہ سے لگی بلک پڑی۔ میں چونک گیا۔ کہیں پھر ایک بار رسوائی تو میرے نصیب میں نہیں ـــــ؟ دل نے کانپ کر پوچھا۔ میں گھبرا گیا۔ میں نے شبو کا سر اپنے سینے سے ہٹا دیا۔ ـــــ

"شبو ـــــ! تم مجھے اتنا ذلیل سمجھنے لگی ہو؟" میرے لہجہ میں کرب ہی کرب تھا۔

"نہیں ماجد! ـــــ میں تمہارے بغیر جی نہ سکوں گی۔ تم سے جدا ہو کر ہر پل انگاروں پر لوٹتی رہی۔ خدا کیلئے مجھے کہیں دور لے چلو، ورنہ میں مر جاؤں گی ـــــ مر جاؤں گی"

اس کی سسکیاں تیز ہو گئیں۔ اس کے ہاتھ میرے گریبان کو تھامے ہوئے تھے۔

کھٹ ـــــ کھٹ ـــــ کھٹ حسن لکڑی ٹیکتے ہوئے چلے آئے۔

"ماجد! یہ سسکیاں شبو کی ہیں نا! دیکھو یہ پھر رونے لگی ہیں۔ میں نے کئی بار سمجھایا۔ میری اندھیری راتیں تو ان کے دم سے روشن ہیں۔ مگر پھر بھی انہیں میرا دکھ کھائے جاتا ہے۔ تم ہی کچھ سمجھاؤ دوست!" احسن کی سحر انگیز آواز سے میں مسحور و مرعوب ہوتا گیا۔

"احسن کتنا پیار کرتے ہیں شبو سے —" میں نے سوچا!

"شبانہ! احسن سچ ہی تو کہتے ہیں۔ آپ ان کی زندگی کا اجالا ہیں۔ حوصلہ رکھئے۔ ہمت سے کام لیجئے۔ اللہ نے چاہا تو یہ دن ہمیشہ نہ رہیں گے۔ آنسوؤں سے بھری دنیا ہم سے صرف صبر مانگتی ہے" میں بمشکل تمام اتنا کہہ سکا۔

شبو گیلی پلکوں سے مجھے تکے جا رہی تھی۔ اور میں ڈوبتا جا رہا تھا درد کے اتھاہ ساگر میں۔

شبو کے گھر سے نکل کر میں اپنے فلیٹ کی طرف روانہ ہوا۔ میرا دماغ الجھنوں کا شکار تھا۔ ایک کے بعد ایک زندگی کے حادثے یہ دن سیمیں کی تصویروں کی طرح میرے سامنے آ رہے تھے —

ماں کی موت، تا جی کا زرد چہرہ، آصف کا ایکسیڈنٹ، نکہت کی نئی اپنی بے عزتی۔ آصف کی غلط فہمی، شبو سے ملاقات اور پھر شبو کی قربت، احسن کی شخصیت کا جادو، — یہ سب میرے ذہن کو ماؤف و معطل کر رہے تھے۔ دفعتاً دل کے کسی گوشہ سے آواز ابھری — یہی وقت ہے شبو کو پانے کا۔ وہ تجھے پیار کرتی ہے۔ تو اسے لے کر کہیں دور چلا جا۔ اس دنیا سے دور، احسن مجبور ہے وہ کچھ نہ کر سکے گا۔ تیرے لئے یہی موقع ہے — خود غرضی کے سارے احساسات بیدار ہو گئے

ایک پل کیلئے میں خاک میں ملتا دکھائی دیا۔

ویسے خاک کا بنا خاک ہی میں تو ملتا ہے۔ پھر بلندی پہ جانے کی سوچ کیوں؟ دل جو کہتا ہے اچھا ہی کہتا ہے۔

"مسٹر ـــــ دیکھ کر چلئے۔ یہ راستہ ہے پارک نہیں۔" قریب سے گزرتے ہوئے ایک بائیسکل سوار نے مجھے ٹھوکا دیا۔

"آں ـــــ!" میں چونک پڑا۔ اپنے چاروں طرف نظر کی۔ موٹروں، سائیکلوں، موٹر سیکلوں اور ٹرکس سے نکلتی ہوئی تیز شعاعوں سے آنکھیں چندھیانے لگیں۔ میں سڑک سے پرے ہٹ گیا۔ ابھی فلیٹ کافی دور تھا۔ میں نے جیب سے ایک سگریٹ نکالا۔ ماچس جلائی اور دھوئیں کے بادلوں میں گھر گیا دماغ نے پھر اپنا کام شروع کیا۔

"شبو! میری جان، میرا ایمان ـــــ وہ کتنی بلک رہی تھی۔ اس نے مجھ سے اپنے آنسوؤں کا واسطہ دے کر سہارا مانگا۔ کتنی تڑپی تھی وہ! میں بھی کتنا سنگدل ہوں۔ اس کے معصوم دل پر کئی بار ضرب لگا چکا۔ چھوٹا سا نازک دل ٹوٹ گیا ہوگا مگر ـــــ نہیں اب ایسا نہ ہوگا۔ میں اسے اپنا لوں گا۔ ـ ـ ـ ـ میں اسے اپنا لوں گا۔" میں نے جلتا ہوا سگریٹ پھینک دیا۔ اور تیز تیز قدموں سے آگے بڑھنے لگا۔ دفعتاً یوں محسوس ہوا جیسے کوئی قہقہہ لگا رہا ہو۔ میں نے دائیں بائیں گھوم کر دیکھا۔ وہاں کوئی نہ تھا قہقہے بلند ہو رہے تھے۔ میرے قدم تیز تیز لڑکھنے لگے۔

"کہاں بھاگے جا رہے ہو دوست! مجھ سے تو ملو۔ قہقہوں میں ڈوبتی ابھرتی آواز میرے قریب آکر رک گئی۔ میں نے دھیرے دھیرے پلکیں اٹھائیں۔

"ارے یہ تو میرا سایہ ہے۔" وہ بھی میرے ساتھ چل رہا ہے۔

"سنو! ـــــ" اس نے مجھے آواز دی۔ میں نے کنکھیوں سے اسے دیکھا۔

کیا تم وہی ہو جس نے اپنی ماں کو مرتے وقت زبان دی تھی کہ تاجی کی شادی کر دو گے؟ تم وہ نہیں ہو جس نے اپنی بہن کی خاطر دن رات محنت کی۔ لیکن اس کے ہاتھ میں مہندی رچا نہ سکے۔ تم وہ نہیں ہو جس نے اپنی شیبو کو محض اس لئے چھوڑ دیا کہ اس کی راہیں تم سے الگ تھیں۔ تم ایک خوددار غیرت مند انسان تھے۔ اور وہ تمہارے پیار میں ڈوبی ہوئی نادان لڑکی! تم آصف کے دوست نہیں جس نے رسوائی کے خوف سے اس کا گھر چھوڑا تھا۔ تم ایک خودغرض اور مفاد پرست انسان ہو۔ تمہارے ناولوں میں لکھی گئیں ایثار کی باتیں محض ایک ڈھونگ ہیں۔ درحقیقت تم مکاری کا لبادہ اوڑھ کر اوروں کو دھوکہ دینے والے انسان ہو۔ حسن جیسے دوست کا اعتماد حاصل کر کے اسے لوٹنا چاہتے ہو — تم — جو دوسروں کے لئے خود کو تباہ کر کے خوش ہوتے تھے — آج دوسرے کی تباہی چاہتے ہو۔ تمہیں کوئی ادیب نہیں کہہ سکتا۔ ادیب کے دل میں تو دنیا کا غم ہوتا ہے۔ تمہیں کوئی انسان نہیں کہہ سکتا۔ کیوں کہ تمہارا مذہب انسانیت نہیں۔ تم اپنی راہ سے ہٹ گئے ہو۔ کتنی گندی بات سوچی تم نے — رات کے اندھیرے میں آگ لگاتے ہو اور دن کے اجالے میں بجھانا چاہتے ہو۔ یہ سب دھوکا ہے۔ فریب ہے — ریاکاری ہے۔ ہا ہا ہا .... ہا ہا ہا .... میرا سایہ قہقہہ لگا رہا تھا۔ میں نے کانوں پر ہاتھ رکھ لئے ......

"خدا کیلئے چلے جاؤ یہاں سے!" میں چیخ اٹھا۔

"نہیں! میں تمہارے ساتھ ہوں اور تمہارے ہی ساتھ رہوں گا!" وہ اب بھی میرے ساتھ تھا۔ اس کے قہقہے تیز تر ہو گئے ہیں۔ میں سڑک پر بھاگنے لگا — "میں تجھے مار ڈالوں گا۔" میرے منہ سے بے ربط الفاظ نکل رہے تھے۔

قہقہے ابلتے رہے۔ میں بھاگتا رہا تیز۔۔۔۔ اور تیز۔۔۔۔ اور تیز۔۔۔۔ اور تیز
اور پھر اکدم جیسے بجلی چمک کر رہ گئی۔ یا دل گرج کر تھم گئے۔ فضا مختلف
آوازوں سے مرتعش۔ اور میں اپنے سائے کو پکڑنے کی کوشش کرتا ہوا سڑک کے نیچے
تھا!! میرے ہاتھ اپنے ہی خون میں رنگے تھے۔!!

"بیچارہ ـــــ پاگل معلوم ہوتا ہے۔ سڑک پہ بھاگ رہا تھا۔" کہیں
دور جیسے بیابانوں سے آواز آئی۔ مجھ پہ غشی طاری تھی۔ میں نے ہاتھ کے اشارے
سے کسی کو بلایا۔ میری آنکھیں دھندلی ہوتی جا رہی تھیں۔

"حسن۔۔۔۔ کا فون نمبر۔۔۔۔ پانچ۔۔۔۔ تین۔۔۔۔ دو۔۔۔۔ آٹھ۔
۔۔۔۔ دو ہے" میرے منہ سے الفاظ ٹوٹتے ہوئے نکلے۔ اور پھر میں نہ جانے کہاں
چلا گیا۔

"آہ۔۔۔۔ آہ۔۔۔۔!" کراہتی ہوئی آواز میرے لبوں سے نکلی۔

"ماجد!۔۔۔۔ میں یہاں ہوں" شبو کی آواز نے میرے کانوں میں
امرت گھولا۔

"میری جان! میرا ایمان ـــــ!" میں درد کی انتہا پہ بھی اسے بھول
نہ سکا۔

"میرے دوست! میں تمہارے قریب ہوں!" حسن کی مسحور کن آواز آئی۔

"آہ۔۔۔۔!" میرے جسم کا ایک ایک حصہ مجروح تھا۔ دماغ بیدار رہنا چاہتا
چاہتا تھا۔ آنکھیں کھلنے کا نام نہ لیتی تھیں۔ دل کی دھڑکن بیٹھی جا رہی تھی۔
دفعتاً میں نے محسوس کیا کہ کسی نے میری کلائی تھام لی ہے۔

"نرس ـــــ کال مسٹر مہترہ" ڈاکٹر کی آواز جیسے بہت دور سے آئی۔

"ڈاکٹر ــــ! میری ایک بات سن لو ۔۔۔۔" میرے زخمی لبوں پہ
پھڑپھڑاہٹ ہوئی۔

"گھبرائیے نہیں آپ ابھی اچھے ہو جائیں گے" ڈاکٹر نے جھوٹی تسلی
دی۔ وہ بھی کیا کرے گا۔ کہہ دے گا کہ تم مر رہے ہو ــــ

"ڈاکٹر ــــ! اگر میں مر جاؤں ۔۔۔۔ تو میری ۔۔۔ آنکھیں ۔۔۔
حسن کو دے دینا ۔۔۔ میرا تمہارا ۔۔۔ احسان مند ۔۔۔ رہوں گا ۔۔۔"
میں نے آہستہ سے آنکھیں کھولتے ہوئے کہا۔

"یہی مسٹر حسن جنہوں نے تمہیں خون دیا ہے ــــ" ڈاکٹر نے کہا۔

"کیا ۔۔۔ خون ۔۔۔ ؟" یہ کہتے کہتے میرے ہی زخموں سے لہو بہہ نکلا

"ہاں ۔۔۔ آپریشن کے وقت انہوں نے ہی تو خون دیا تھا آپ کو۔ اچھا
ہوا کہ آپ نے ان کا فون نمبر دے دیا" ڈاکٹر نے مجھ سے کہا۔

"آہ ۔۔۔ تو کیا ۔۔۔ حسن جیت گئے؟" میں تڑپ اٹھا۔ شبو کی سسکیاں
میرے قریب ہی گونج رہی تھیں۔

"ماجد ۔۔۔! میرے دوست! کاش میں تمہارے زخم لے سکتا" حسن
کی خلوص میں ڈوبی آواز ابھری۔

"حسن ۔۔۔ میرے دوست ۔۔۔ زخم تم ۔۔۔ نہ لے سکے ۔۔۔ مگر ۔۔۔
ایک احسان ۔۔۔ کر دو مجھ پہ ۔۔۔ میری آنکھیں میرے مرنے کے بعد ۔۔۔ شبانہ
کے چہرے کی ۔۔۔ زینت بنیں ۔۔۔! وعدہ کرو ۔۔۔ مجھ سے ۔۔۔" شبو
نے اپنا زخمی ہاتھ اٹھایا۔ حسن ٹوٹا ہوا میرے قریب آیا۔

"تم اچھے ہو جاؤ گے ماجد! ۔۔۔ حوصلہ رکھو ــــ" اس نے کہا۔

"حسن .... میری زندگی کی شام ڈوب کر بھی .... روشن رہے گی۔
تمہارے چہرے پر .... میری جان کیلئے .... میرے .... ایمان کیلئے۔
... میرے منہ سے بے ربط جملے نکل رہے تھے۔ میں نے دیکھا ماں! سفید آنچل
پھیلائے مجھے بلا رہی ہے۔ "ماجی زرد چہرے سے مجھے تاک رہی تھی۔ دور....
دور کہیں کوہساروں کے پیچھے شام ڈوب رہی تھی۔ .... سورج کا قتل ہو چکا
تھا۔ چاند کی سیج سجنے والی تھی۔ ایک تارہ میری آنکھوں سے ٹوٹ کر نکلا —
"شبو .... ! میری جان .... میرا ایمان .... سانس کی آخری ڈور
جاتے جاتے بندگی کا حق ادا کر گئی !!

(بیسویں صدی" مارچ ۱۹۷۲ء)

شبِ غم سنور گئی

شبنم کی مخروطی انگلیوں میں اعجاز کا بھیجا ہوا تار تھا۔ وہ خوشی سے بے قابو ہوئی جا رہی تھی۔ اعجاز، اس کی زندگی کا مالک آج پورے آٹھ ماہ بعد آ رہا تھا۔ آٹھ ماہ کا یہ طویل عرصہ کیسا گزرا، یہ کوئی اس کے دل سے پوچھے۔ اسے یوں لگا جیسے وہ آج ہی دلہن بنی ہو۔ اور اپنے پیا کے گھر آ گئی ہو۔ شادی کے صرف چار ماہ بعد ہی اعجاز کو محاذ پر جانے کا بلاوا آ گیا تھا۔ اس روز شبنم کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔ اعجاز نے جاتے ہوئے کہا تھا۔ شبنم! خدا کے لئے میرا امتحان نہ لو۔ تمہارے بہتے ہوئے آنسو مجھے روک لیں گے۔ میں اپنے وطن کی حفاظت کے لئے جا رہا ہوں۔ ایسے وقت اگر ہمت دم توڑ دے تو میں بزدل ہو جاؤں گا۔ اور پھر شبنم نے چپ سادھ لی۔ اعجاز کی کار پورٹیکو سے نکل گئی۔ وہ دیر تک خلاؤں کو گھورتی رہی۔ چونکی اس وقت جب نسرین کی سسکیاں فضاء کو دہلا رہی تھیں۔ اس نے مڑ کر دیکھا نسرین دیوار کا سہارا لئے دوپٹے سے اپنے چہرے کو چھپائے سسک رہی تھی۔

"نسرین! تم رو رہی ہو۔ ایک بہادر بھائی کی بہن آنکھوں میں آنسو نہیں لاتی۔ ابھی صابر، اس کا تحمل، اس کا ایثار، اور اس کی ہمت اندھیروں کو اجالوں سے بدل دیتی ہے۔ تمہارے بھیا تم سے دور نہیں گئے۔ وہ اب تک ہمارے ہی ساتھ ہیں۔ پگلی! کہیں تصور کی دنیا کو بھی کوئی چھین سکتا ہے۔" اور پھر شبنم نے نسرین کو بھینچ لیا۔

آج تو ـــــ آج تو جیسے نسرین بھی باؤلی ہو گئی۔ اللہ اللہ کر کے انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں۔ اور اعجاز آ گیا۔ نسرین کو اس نے سینے سے لگا لیا۔ ایک ہی تو بہن تھی اس کی؛ ـــــ شبنم سمٹ کر اعجاز کی باہوں میں یوں چلی آئی جیسے کوئی ڈولتی ہوئی کشتی ساحل پر جا کر رک جاتی ہو۔ شبنم اور نسرین کیلئے دن عید اور رات شب برات سے کم نہ تھی۔ مگر وقت تو پر لگا کر اڑ جاتا ہے۔ ایک ماہ کا عرصہ ختم ہوا اور اعجاز نے رختِ سفر باندھا۔ اس بار جانے کیوں شبنم کے آنسو تھمنے کا نام ہی نہ لیتے تھے۔ اعجاز کے لئے رکنا بھی محال تھا۔ سرحد پر جنگ کے مہیب اور خوفناک سائے رینگ رہے تھے۔ وطن کا ذرہ ذرہ پکار کر کہہ رہا تھا مجھے بچالو! میری چھاتی پر کسی اجنبی کے قدم نہ پڑیں۔ اور مادرِ وطن کے سپوت اس پکار پر اپنا سب کچھ چھوڑ کر جا رہے تھے۔ اعجاز بھی تو اپنی ماں کا ہی بیٹا تھا۔ ماں کے مرنے کے بعد اس نے اس مٹی ہی کو ماں سمجھا جس میں اس کی ماں مل چکی تھی۔ شاید اسی جذبے نے اسے فوج میں بھرتی کروا دیا۔ ان حالات کے تحت وہ کیسے رک سکتا تھا۔ رشتے سسکتے رہے، جذبات طوفان بن کر راستہ روکتے رہے۔ خیالات کے تلاطم نے اس کو اپنی موجوں میں پکڑ لیا۔ مگر اعجاز نے اپنی ماں کی پکار پر لبیک کہنے کو ترجیح دی۔ اور آنسوؤں کی آنچل کے بیچ شبنم اور نسرین کو چھوڑ دیا۔

وقت ـــــ جو مسیحا بھی ہے اور قاتل بھی۔ اعجاز کی آمد پہ وہ مسیحائی
کر گیا۔ مگر اس کی روانگی کے دوسرے ہی دن خبر آئی کہ اس کا طیارہ دشمن کی بمباری
کا شکار ہو چکا۔ نسرین اور شبنم وقت کے اس ہولناک مذاق کو سہہ نہ سکے۔ دل ٹوٹ
کر چور چور ہو گیا۔ دونوں تنہا رہ گئے۔ کون کس کے آنسو پونچھے۔؟ کون کس کو تسلی دے؟
جب کہ دونوں ہی غم خوار تھے۔ دونوں ہی آنسوؤں کا سمندر اپنے پلکوں میں چھپائے
بیٹھے تھے۔ شبنم کی دنیا لٹ گئی تو نسرین بے آسرا ہو گئی۔ شبنم کی مانگ اجڑ گئی۔
نسرین کا جیسے بازو کٹ گیا۔ کس کو دوش دیا جا سکتا تھا؟ قدرت تو ہر حال میں خود
کو منوانا چاہتی ہے۔ زبان چپ تھی۔ مگر دھڑکتا ہوا دل بار بار یہی سوال کرتا۔

ـــــ زندگی ہار کیوں جاتی ہے؟ موت ازل سے فاتح کیوں ہے؟ جنگ کیوں ہوتی ہے؟
نفرت کیوں ہوتی ہے؟ اقتدار کی ہوس کیوں ہوتی ہے۔ مانگ کا سیندور راکھ کیوں ہو
جاتا ہے؟ چوڑیاں ٹوٹ کر بکھر کیوں جاتی ہیں؟ چمکتی ہوئی جبیں ویران کیوں ہو جاتی
ہے؟ آنکھوں کے دیئے ٹمٹمانے کیوں لگتے ہیں؟ پل بھر کی خوشیاں دامن میں پناہ
لینے کیوں آتی ہیں؟ جب ویرانی ہی راج کرنا چاہتی ہے تو پھر تقدیر آبادی سے
ناطہ کیوں توڑتی ہے۔ لمحے بھر کیلئے ہنستے ہوئے پھول سے چہروں پر خزاں کے جھونکے کیوں
چلے آتے ہیں ـــــ؟"

لیکن ان تمام سوالوں کا جواب غم سے بوجھل دماغ دے نہ سکا۔ کارواں بنتے
ہیں بدلتے ہیں مٹ جاتے ہیں۔ وقت آتا ہے اور گزر جاتا ہے پھر کبھی نہ آنے کے لئے۔
ـــــ جہاں وہ ظالم ہے وہیں چارہ گر بھی۔ اعجاز کی موت کا خلاء تو پر ہونا ناممکنات
سے تھا مگر جینے والوں کو تو ہر حال میں جینا ہی پڑتا ہے ـــــ حیات کی ڈور کو
سنبھالے رکھنا تو ضروری ہوتا ہے۔ چاہے آنکھ میں دم ہو یا نہ ہو۔ ہاتھ میں جنبش رہے

یا نہ رہے۔ اعجاز کی موت نے دو کہانیاں ادھوری چھوڑ دی تھیں۔ تخلیق کار کا اپنا وجود باقی نہ رہے تو اس کی کہانیاں کس شمار میں ——— مگر پھر بھی یہ کہانیاں بڑھتی رہیں۔ شاید کوئی راہ گیر مل جائے۔

دفعتاً جیسے سونے آنگن میں کسی کوئل نے کوک لگائی ہو۔ جیسے اچانک ویرانے میں بہار کا کوئی جھونکا آ جائے۔ جیسے اندھیری راتوں میں یک بیک چاند جلوہ گر ہو جائے وسیم ان کے گھر میں داخل ہوا۔ وسیم جو شبنم کا ماموں زاد بھائی تھا جس نے بچپن ہی سے شبنم سے پیار کیا تھا۔ وہ بھی تو اس سے ایک معصوم لگاؤ ایک والہانہ چاہت رکھتی تھی۔ مگر ہر یتیم کی طرح اس سے بھی دنیا نے مذاق کیا۔ ماموں اور ممانی نے اسے بوجھ سمجھا۔ اور اپنے لئے خطرہ سمجھ کر وسیم کو تعلیم کیلئے دہلی بھجوا دیا۔ اور پھر ایک سیاہ رات کو اسے کسی اجنبی ہاتھوں کے حوالے کر دیا۔ یہ اجنبی ہاتھ اعجاز کے تھے۔ شبنم کی شادی اعجاز سے ہوئی تو، مگر نہ دھوم دھام سے برات آئی، نہ شادیانے بجے نہ سہاگ گیت گائے گئے بس کسی نے نکاح کے دو بول پڑھا دیئے۔ اور وہ چپ سر جھکائے اپنے مقدر کا فیصلہ سنتی رہی۔ ایک نئے گھر میں اس کا استقبال ایک معصوم لڑکی نے کیا کیا یہ نسرین تھی۔ اعجاز کی بہن۔ اعجاز سے یوں چپ چاپ شادی کرنے کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ اس کے ماموں ممانی جانتے تھے کہ اعجاز فوج میں ملازم ہے۔ نہ آگے نہ پیچھے۔ لے دے کے ایک بہن ہے۔ چاروں طرف جنگ کے بادل امڈے چلے آ رہے ہیں۔ اعجاز کی زندگی ٹمٹماتے چراغ سے کم نہ تھی۔ کسی بھی وقت جنگ کا خوفناک جھونکا آ جائے تو اس کی زندگی کا چراغ اپنے ملک کی حفاظت کرتے کرتے ہی گل ہو سکتا تھا۔ شائد شبنم کے ساتھ اعجاز کو منسوب کرنے کا یہ بھی اک مقصد رہا ہو گا کہ اس کی مانگ سنورتے سنورتے اجڑ جائے۔ اور ہوا بھی یہی۔ صرف ایک سال اس نے زندگی کی رنگینی دیکھی

اور پھر جیسے چاروں طرف اُڑتی ہوئی دھول رہ گئی۔

"آج وسیم کی آمد نے اسے ماضی کے دھندلکوں میں کھونے پر مجبور کر دیا۔ وسیم نے اعجاز کی موت کی خبر سنی اور آنسو پونچھنے چلا آیا۔ شبنم محسوس کر رہی تھی کہ وسیم اس کے قریب آتا جا رہا ہے۔ ایک تاریک رات کو اس نے کہہ دیا۔

"وسیم! مجھے تاریکی سے پیار ہے۔ تم مجھے روشنی کی طرف نہ لے جاؤ۔ اس کی چمک میری آنکھوں کیلئے نہیں ہے۔ میرے حصہ میں سیاہی ہے۔ تم اجالوں کی امید مجھ سے نہ رکھو۔ میری آرزوئیں اعجاز کے ساتھ ہی مٹ چکیں۔ اعجاز کے خون میں میری حسرتوں، میری تمناؤں کے قطرے بھی شامل ہیں۔ خدا کے لئے ان قطروں کو دریا نہ بناؤ۔ میں ان کو گوہر سمجھتی ہوں۔ اس کی چمک میں ہی اعجاز کی زندگی ہے۔ تم اپنے ماں باپ کی آرزوؤں کا مرکز ہو جاؤ۔ ان کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کرو۔ مجھے تنہا چھوڑ دو۔ وہ رو پڑی۔

"شبنم! اگر میں تمہارا نہ بن سکا تو ساری عمر تنہائی کی آگ میں جلتا رہوں گا۔ لیکن کسی اور ساتھی کا تصور بھی میرے لئے سوہانِ روح ہے۔" وسیم اتنا کہہ کر اندر چلا گیا۔

وہ سسکتی ہوئی بستر پر گر پڑی۔ آنسوؤں کے ساغر چھلکتے رہے۔ موتیوں کی لڑیاں ٹوٹ کر بکھرتی رہیں۔ دل کا آبگینہ چور چور ہوا۔ اس کی ساری کرچیں جسم میں چبھتی رہیں۔ اس کا فیصلہ اس کی قسمت بدل سکتا تھا۔ پل بھر کیلئے ایک انجانی سی خواہش نے سر ابھارا! مگر دوسرے ہی لمحہ میں اعجاز اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگا۔ شبنم! نسرین کے لئے کیا سوچا تم نے۔؟ ——— دور بہت دور خلاؤں میں آواز ابھری۔ وہ تڑپ اٹھی۔ نہیں اعجاز نہیں۔ میں خود کو فراموش کر چکی ہوں۔ مجھے اپنے لئے نہیں تمہارے لئے جینا ہے تم سمجھتے ہو تمہاری موت نے ہم دونوں کے درمیان دیوار کھڑی کر دی ہے ———

نہیں ہوا کے جھونکے قید نہیں کئے جا سکتے۔ پیار کی خوشبو بند نہیں ہو سکتی۔ تم کو کھو کر

بھی میں اپنے قریب پاتی ہوں۔ ہاں یہ ضرور ہے بعض وقت شدت جذبات سے مغلوب ہو کر اپنی دنیا میں کھو جاتی ہوں۔ لیکن دوسرے پل سوچتی ہوں کہ میں اپنے لئے نہیں نسرین کیلئے جی رہی ہوں یں۔ جو کہانی تم نے ادھوری چھوڑ دی اس کو میں مکمل کر دوں گی !!"

"بھابی! .... بھابی! .... نسرین دروازے پر زور زور سے دستک دے رہی تھی۔ اس کے سارے خیالات جیسے ختم سے گئے۔ اس نے اٹھ کر دروازہ کھولا نسرین اس کے سامنے کھڑی تھی۔

"بھابی ــــ وہ جو ــــ وہ جو آپ کے بھائی ہیں نا ــــ وہ ــــ برآمدے میں کرسی پر ــــ بے ہوش پڑے ہیں" نسرین سانس کے اتار چڑھاؤ پر قابو پاتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"کون وسیم؟ ــــ کہاں ــــ کب کیسے؟ ــــ" شبنم نے سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔

"میں نہیں جانتی" نسرین نے شانوں کو جنبش دے کر کہا۔ وہ برآمدہ کی جانب دوڑی۔ وسیم ایزی چیئر پہ بے ہوش پڑا تھا۔ گردن ایک جانب جھول رہی تھی نسرین اور شبنم دونوں نے مل کر بڑی مشکل سے اسے اٹھایا اور پلنگ پر لٹا دیا۔ بخار سے اس کا جسم پھنک رہا تھا۔ شبنم ڈاکٹر کو فون کرنے کے لئے پڑوسی کے گھر چلی گئی۔ اور نسرین اس کے قریب بیٹھی رہی۔ کچھ ہی دیر بعد ڈاکٹر آیا۔ دوا دی اور انجکشن لگا کر رخصت ہو گیا۔ اور تاکید کی کہ رات بھر پیشانی پہ کپڑا بھگو کر رکھتے رہیں۔ شبنم اس کام کیلئے تیار ہو گئی لیکن نسرین اس سے پہلے ہی وہاں موجود تھی۔ رات بھیگ رہی تھی۔ دادا اس جواینلال مصروف خدمت تھیں۔ شبنم نسرین کے حرکات کا بغور جائزہ لینے لگی۔ اس کا چہرہ اترا

ہوا تھا۔ پریشانی سے بال بے ترتیب ہو گئے تھے۔ آنکھوں سے وحشت جھانک رہی تھی۔
صبح کی اوّلین ساعتوں میں وسیم نے پانی مانگا۔

"اللہ تیرا شکر ہے میں تو ——" نسرین بے اختیار کہہ اٹھی۔ شبنم نے اس کا چہرہ اوپر اٹھایا۔ دور کہیں ستارے جھلملا رہے تھے۔ نسرین نے گردن جھکا لی۔
"نسرین! مجھ سے دل کی بات چھپاؤ گی۔" اس نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

"بھابی! —— آپ تو میری ماں ہیں نا! ماں بچے کی حرکات سے اندازہ لگا لیتی ہے کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ اسے کس چیز کی ضرورت ہے۔" نسرین دھیمے دھیمے لہجہ میں کہہ رہی تھی۔ شبنم جیسے خیالوں میں کھو گئی۔

"تو اتنے دن تک میں نے سمجھا نہیں۔" وہ خود سے پوچھ بیٹھی۔ "تجھے اپنے غم سے فرصت کب تھی" دل نے سرگوشی کی۔ "نہیں تم کہتے ہو۔ میں تو زمانہ ہوا خود کو بھول گئی غم کا جذبہ کہاں ملے گا ان ویران گوشوں میں۔" اس نے کہا۔ "پھر —— نسرین کے دل کی بات سمجھنے میں اتنی دیر کیوں لگا دی۔" —— ؟ "صرف اس لئے کہ تم اپنے ہی بارے میں سوچ رہی تھیں۔" دل بحث پہ آمادہ تھا۔

"نہیں نہیں نہیں —— مجھے الزام نہ دو۔ میں مانتی ہوں۔ جذبات کے دھارو ں نے مجھے بہہ جانے پہ مجبور کیا تھا۔ مگر . . . . مگر اب ایسا نہیں ہوگا۔ اس نے گردن جھٹک دی۔ وسیم نے جس دن آنکھیں کھولیں۔ نسرین نے گیلے بالوں سے نماز ادا کی۔ اور شبنم نے اللہ کی راہ میں غریبوں کو کھانا کھلایا۔

"تم لوگوں نے میرے لئے جو تکلیفیں اٹھائیں اس پہ میں بہت شرمندہ ہوں۔ یہ احسان میں —— وسیم کی زبان نسرین نے بند کر دی۔

"مہمان کیلئے کی جانے والی خاطر داری کو احسان نہ سمجھئے۔" وہ اسے کنکھیوں سے دیکھتے ہوئے بولی۔

"لیکن ــــ قبل اس کے کہ وہ کچھ کہتا۔ شبنم آگے آئی۔

"اس کے آگے نہ جائیے۔ عجز و انکساری اچھی ضرور ہے۔ مگر اپنوں کے ساتھ ایسی باتیں بیگانگی پیدا کر دیتی ہیں۔ ہے نا ــــ؟" شبنم نے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

وسیم ہکا بکا اس کو دیکھتا رہ گیا۔ اتنے بے تکلفانہ انداز سے تو کبھی اس نے بات ہی نہ کی تھی۔ اور آج ــــ آج وہ جیسے چاندنی کی طرح کھلی ہوئی تھی

"نسرین! تم اوما کے پاس جانے والی تھیں نا؟ چلی جاؤ۔ شام سے پہلے لوٹ آنا۔" شبنم نے نسرین کی طرف دیکھ کر کہا۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ اشارے بھی ہوئے۔ جنہیں وسیم کچھ سمجھ نہ سکا۔ نسرین اٹھ کھڑی ہوئی اور شرماتی ہوئی کمرہ سے باہر نکل گئی۔ وسیم شبنم کو گھورے جا رہا تھا۔

"یہ اس طرح کیوں گھور رہے ہو" شبنم پاس پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھتی ہوئے بولی۔

دیکھ رہا ہوں پھول کیسے ہنستے ہیں۔ کلیاں کیسے چٹکتی ہیں۔ ہوا کے جھونکے کب خوشبو اپنے ساتھ لے آتے ہیں۔ فضائیں کب رنگین ہوتی ہیں۔ ماحول کب گنگنانے لگتا ہے۔ چاند بادل کی اوٹ سے نکل کر کب مسکراتا ہے۔" وہ شبنم کے چہرے کو گھورتا ہوا کہہ رہا تھا۔

"ان سب باتوں کا جواب صرف یہی ہے کہ جب انسان خوش ہوتا ہے تو کائنات بھی دل نواز ہو جاتی ہے۔" شبنم نے جواب دیا۔

"تمہیں کون سی خوشی ملی ہے ——— ؟" وہ خوابناک لہجہ میں بولا۔
"شبِ غم کے سنورنے کی ———" اس نے قریب ہی گلدان سے پھول توڑتے ہوئے کہا۔

"وہ کیسے ——؟" وہ حیران تھا۔

"وسیم! زندگی، کچھ پانے سے زیادہ کچھ کرگزرنے میں ہے۔ خوشی اور مسرت کی تلاش میں انسان ساری زندگی جدوجہد کرتا رہتا ہے۔ کبھی وہ ہاتھ آجاتی ہے اور کبھی قریب سے ہوکر گزر جاتی ہے۔ میں اسے انسان ہی نہیں سمجھتی جو اپنے ہی وجود میں گھرا رہے۔ اپنے ہی غم کو سرمایہ سمجھے۔ سچ تو یہ ہے کہ خود کو دوسروں کے لئے وقف کردو۔ چراغ دوسروں کے لئے اجالے بکھیر کر اپنے تلے تاریکی رکھتا ہے۔ پھول مرجھاتا ہے، کلی کو ہنسانے کیلئے۔ بادل خود پیاسے ہوتے ہیں۔ لیکن دھرتی کی پیاس بجھاتے ہیں۔ پیڑ اپنے پھل نہیں کھاتا۔ وہ دوسروں کے لئے پھل دیتا ہے۔ سچی مسرت کا متلاشی اپنے لئے نہیں اوروں کیلئے جیتا ہے" شبنم خلاؤں میں دیکھتی ہوئی کہہ رہی تھی۔

"میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا ——— ؟" وسیم کی سراسیمگی بڑھتی جا رہی تھی۔

"وسیم! نسرین میری نند نہیں وہ میری بیٹی ہے۔ طعنوں اور مشغولوں کی دنیا سے نکل کر جب میں نے اس گھر میں اپنے قدم رکھے تو ایک معصوم اور مقدس مسکراہٹ نے میرا استقبال کیا۔ اس کی آنکھوں کی سچائی نے مجھے سمجھایا کہ زندہ رہو اور ان کے لئے جو تمہارے ہیں، جن کا کوئی اور نہیں۔ نسرین بھی تو اکیلی تھی۔ میرے آجانے سے وہ بہل گئی۔ آج امی جان اگرچہ نہیں ہیں۔ لیکن میں ہر دم انہیں اپنے قریب پاتی ہوں۔ نسرین سے ان کو پیار تھا۔ وہ اس کی ہر خواہش کی تکمیل کیلئے جدوجہد کرتے رہے۔

آج ان کی جگہ میں ہوں۔ اس نے مجھ سے کچھ مانگا ہے۔" شبنم نے کہا۔

"تو ٹھیک ہے کیا چاہیئے اسے ——؟" وسیم نے پوچھا۔

"تم ——" شبنم یکبارگی بول اٹھی۔

"کیا —— نہیں —— ایسا نہیں ہو سکتا۔ تم پاگل ہو گئی ہو۔" وسیم کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"میں پاگل نہیں ہوں بلکہ دوسروں کے پاگل پن کا علاج کر رہی ہوں۔ نسرین کو تم سے پیار ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ تم اس کو اپنا لو۔"

"نہیں —— میں مجبور ہوں۔" وسیم نے گردن جھٹک دی۔

"تم مجبور نہیں ہو۔ ضدی نہیں ہو۔ وقت کے تقاضے کو سمجھو۔ زندگی گزرنے کو گزر ہی جائے گی۔ مگر تم سکون کیلئے تڑپتے رہو گے۔" شبنم نے کہا۔

"اور نسرین گویا مجھے سکون دیگی" وہ طنزیہ نظر اس پر ڈالتا ہوا بولا۔

"ہاں کسی غم کو اپنا کر ہی انسان خوش ہوتا ہے۔ سچی محبت کا راز اپنی ذات کی خوشیوں سے وابستہ نہ کرو۔ دوسروں کو سکھ دے کر تم خوشیوں کے خزانے سمیٹ سکو گے۔ پرائی آگ میں جل کر ہی تو انسان کندن بن جاتا ہے۔ ایک بار تم اپنے آپ کو اوروں کی خوشیوں پر قربان کر کے دیکھو۔ تمہارا دل چاہے گا کہ تم بار بار مٹتے رہو اور بار بار بنتے رہو۔ تاکہ تمہیں ایثار کا موقع ملتا ہی رہے۔ سچا سکون دوسروں کو سکون پہنچا کر ہی حاصل ہوتا ہے۔ کسی کی ایک مسکراہٹ کیلئے اپنی آرزوؤں کو جلا کر دیکھو۔ پھر تم جینے کی تمنا ہی کرتے جاؤ گے۔ خدا گواہ ہے، اس میں میری کوئی غرض شامل نہیں۔ انسانیت کے تقاضے کو پورا کرنے کیلئے تم سے تعاون چاہتی ہوں۔ یہ دامن خدا کے بعد تمہارے آگے پھیلا ہے۔ اقرار کے سکے ڈال دو اس میں۔ میری دنیا سنور جائیگی۔

میری شبِ غم کی سحر ہو جائے گی۔ رات ڈھٹ کر اجالوں کا سلام مجھ تک پہونچائے گی۔ ورنہ ـــــ ورنہ شائد میں بھی ایک تاریک رات ہی بن جاؤں۔" شبنم کا دامن وسیم کے آگے پھیلا ہوا تھا۔

"شبنم! اگر تم اس میں خوش ہو تو مجھے منظور ہے۔ میں اپنی لاش کا بوجھ اٹھائے زندگی گزار دوں گا۔" وسیم نے کہا۔

"نہیں وسیم! میں مایوسیوں کے چراغ جلانے پر تمہیں آمادہ نہیں کر رہی ہوں یہ شمع جو نسرین کی شب عروسی کو اجالا بخشنے کی تھیں اور مجھے جلانی ہو گی۔ اس کی لو تمہیں راستہ دکھاتی رہے گی۔ میں اپنے فرض کی تکمیل تمہاری تمناؤں کے خون سے نہیں کروں گی۔ لیکن ایک بات یاد رکھو! سجدہ گزاروں کیلئے مقام کی قیدیں نہیں وہ تصورِ محبوب میں ہر جگہ ہی سجدہ کرتے ہیں۔ سجدے کبھی مقام کے محتاج نہیں ہوتے۔ یہ خاک پر بھی کئے جاتے ہیں اور مخمل پہ بھی کئے جاتے ہیں۔ قبولیت ہر حال میں ہوتی ہے۔ بشرطیکہ صدق دل سے ہو۔ زندگی کی قدر کرنا سیکھو وسیم! یہ پامال ہونے کیلئے عطا نہیں کی گئی ہے۔"

تم ٹھیک کہتی ہو شبنم! زندگی پامال ہونے کیلئے نہیں دی گئی۔ آج میں نے سمجھا کہ انسان کی اپنی خواہشیں اس کو صرف جلا سکتی ہیں۔ مگر دوسروں کی آرزوؤں کی تکمیل کر کے وہ جِلا پاتا ہے۔ تمہارے خیالات کی میں قدر کرتا ہوں۔ تم مجسّم پاکیزگی ہو شبنم! مجھے معاف کر دینا۔ مجھے معاف کر دینا۔" اور پھر وسیم نے بے پناہ عقیدت سے اس کے ہاتھ چوم لئے۔ اس کی آنکھوں سے گرتے ہوئے آنسو شبنم کی کلائیوں پر گرتے رہے۔ جیسے انہیں وضو کرا رہے ہوں۔ شبنم کی آنکھوں کے گوشے نمناک ہو گئے۔ وہ اپنے نام کی گہرائی میں ڈوب گئی۔ آسمان کی وسعتوں سے

نکل کر جب شبنم پھول پتوں کے دامن پہ گرتی ہے تو خود مٹ کر ان کو حیات بخشتی ہے۔ گویا انہیں نہلا کر ان پر پڑی ہوئی گرد کو صاف کرتی ہے۔ اگرچہ اس کے لئے اس کو انتہائی بلندیوں سے نیچے آنا پڑتا ہے!! ▲

("شاعر" بمبئی ستمبر ۱۹۷۱ء)

شمع ہر رنگ میں جلتی ہے

لضرت کاٹیج، الہ آباد

ڈیر رخشی! خوش رہو

طویل مدت کے بعد تم سے مخاطب ہوں۔ نہ جانے تم نے کیا سوچا ہوگا۔ کتنی بے وفا نکلی تمہاری ترنم! شاید وہ میری شادی کی دوسری سالگرہ تھی جب تم اچانک اپنے شوہر کے ساتھ الہ آباد چلی آئیں۔ میں بھی وہیں تھی اور اتفاق کی بات کہ الیاس اور اشفاق بھیا دوست نکلے۔ سالگرہ کی دعوت الیاس نے اشفاق بھیا کو دی تھی۔ شام کو تم اور بھیا ساتھ آئے۔ میں تمہیں دیکھ کر حیران ہو گئی تم بھی کتنی پریشان ہوئی تھیں مجھے دیکھ کر۔ تم شادی میں نہیں آئی تھیں نا! اس لئے الیاس کو نہیں دیکھا تھا۔ حالانکہ میں نے تمہیں کئی دن پہلے اطلاع دی تھی لیکن تم اپنی مجبوریوں کا رونا لے بیٹھی تھیں۔

ہاں تو میں کہہ رہی تھی، وہ میری شادی کی دوسری سالگرہ تھی اور آج بھی میری شادی کی آٹھویں سالگرہ ہے، لیکن تمہیں معلوم ہے الیاس میرے پاس نہیں۔ وہ تو شاید دارجلنگ میں زوبینہ کے ساتھ گھوم رہے ہوں گے اور میں بستر مرگ پہ پڑی تمہیں خط لکھ رہی ہوں۔

ہاں رخشی! قسمت نے مجھے موت کے قریب لاکھڑا کیا ہے۔ تم اکثر کہا کرتی تھیں، ترنّم! تجھے کیا ہے عزت، دولت، تعلیم اور حسن، خدا نے سب کچھ تو دے دیا ہے۔ تو تو رانی بن کر رہے گی! لیکن جانتی ہو آج میں کتنی کسمپرسی کے عالم میں زندگی کے آخری لمحات پورے کر رہی ہوں؟

سالگرہ کے دن تم نے مجھ سے سوال کیا تھا ـــ ترنّم! کیا بات ہے دولھا بھائی کو پاکر بھی تو کچھ کھوئی کھوئی سی رہتی ہے؟

"چل پگلی! تو نے مجھے کئی دن بعد دیکھا ہے نا!" میں نے ہنس کر بات ٹال دی۔ تم نے اصرار مجھ سے کرید کرید کر سوال کرتی رہیں کہ میری شادی الیاس سے کیسے ہوئی؟ میں خاموش رہی اور یہ کہہ کر ٹالتی رہی کہ وقت آنے پر بتادوں گی۔ وقت اب آچکا ہے اور اگر اس وقت میں نے تم سے چھپایا تو میری روح زخمی رہے گی۔ تمھیں یاد ہے رخشی! ایک بار کالج میں تم نے مسکراتے ہوئے مجھ سے سوال کیا تھا ـــ

"تو نے کبھی کسی سے محبت کی ہے ترنّم!"

"محبت ـــ نہیں تو!" میں نے حقیقت چھپالی تھی۔

رخشی! میرے لیے ہر لمحہ بوجھ ہے۔ سانس کی دیوار گرنے کو ہے سینہ زخموں سے چور ہو گیا ہے۔ کالج میں بیتے ہوئے ایک ایک دن کی یاد میرے ذہن میں محفوظ ہے جب تنہائی ہوتی ہے تو اُس یاد کو ذہن کے دریچے سے نکالتی ہوں اور تصور کے پردے میں اُس کا عکس دیکھنے لگتی ہوں۔ جب تھک جاتی ہوں تو آنکھیں موند لیتی ہوں لیکن رخشی! مجھے سکون نہیں ملتا۔ ہائے اللہ! کتنے کربناک لمحے میری زندگی میں آئے! کتنے حادثات نے مجھے ستایا!

ابھی رخشی! تمھیں یاد ہے اردو کے پیریڈ میں ایک بار غالب کی غزل سمجھاتے

سنبھلتے جب مسز ممتاز رک گئیں تو میں نے بے اختیار اُن سے سوال کیا۔

"آپا! آگے کا شعر کیوں چھوڑ دیا؟"

"ترنم! میں نے شعر کو چھوڑا نہیں، شعر میں کھو گئی۔ کتنا پیارا شعر ہے ؎

غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج

شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

ابھی مسز ممتاز نے یہ شعر ختم ہی کیا تھا کہ گھنٹی بج گئی۔ میں شعر کی تشنگی لئے گھر پہنچی۔

تمھیں معلوم ہے رخشی! ہمارے گھر میں ممی کے غریب بھائی کا لڑکا رہتا تھا۔ یاد ہے تم نے ایک بار اُس کی تصویر دیکھ کر مجھ سے کہا تھا۔

"ہائے ترنم! کیا دلفریب صورت پائی ہے۔ معلوم نہیں کتنوں کا دل چرایا ہوگا۔"

"ایک دم بدھو ہے۔ ہر بات کرتا ہے اور شرما جاتا ہے۔ حالانکہ اس وقت بی۔اے کا کام کر رہا ہے لیکن صورت سے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کسی چڑیا گھر کا بندر۔ اللہ جانے کیا سمجھتا ہے اپنے آپ کو جیسے بہت بڑا فلسفی ہے! ہونہہ —!" میں نے اُس کی برائی کی۔

"کیوں — کون ہے وہ؟" تم نے سوال کیا۔

"میرا تو کوئی نہیں ہوتا۔ ممی کہتی ہیں اُن کے عزیز کا بیٹا ہے۔ بے چارے غریب ہیں اس لئے پپا نے رحم کھا کر اُسے اپنے پاس بلا لیا۔ پپا کا کہنا ہے، لڑکا ہونہار ہے۔ اگر کچھ پڑھ لکھ لے تو زندگی سنور سکتی ہے۔" میں نے تمھیں سب کچھ بتا دیا۔

"اچھا تو یہ بات ہے! میرا خیال ہے بالکل اُس بدھو کے گلے میں ابّی بے وقوف کو باندھیں گے!" تم نے مجھے چھیڑتے ہوئے کہا۔

"کیا بکتی ہو! میں بھلا اُس سے شادی کروں گی۔ جیسی بد معقول کہیں کا!" میں نے کہا تھا

لیکن رخشی! تم نہیں جانتی تھیں کتنا عظیم ہے وہ! اُس دن غالب کے اس شعر کو سمجھنے کے لئے میں نے سوچا چلو آج ندیم کے پاس چلیں۔ دیکھیں وہ کتنا قابل ہے۔

"ندیم بھائی ــــ! غالب کا یہ شعر ہماری سمجھ میں نہیں آتا پلیز ذرا سمجھا دیجیئے نا!"
میں نے ایکٹنگ کرتے ہوئے کہا۔

"تشریف رکھیئے، مسٹر" جلتے ہی وہ اُٹھ کھڑا ہوا جیسے میں کوئی افسر تھی اور وہ میرا ماتحت! میں بیٹھ گئی۔

"کون سا شعر؟" اُس نے سوال کیا۔

"یہ ــــ" میں نے شعر پہ اُنگلی رکھی۔ شعر پڑھ کر وہ کچھ دیر سوچتا رہا اور پھر بے چین ہو کر کھڑا ہو گیا۔

"کیا ہوا ــــ؟" میں نے پوچھا۔

ترنم! تم غالب کی عظمت سے انکار تو نہیں کرتیں نا! غالب اپنے ہی دور کا نہیں ہر آنے والے دور کا منفرد شاعر ہے۔ زندگی کی ہر دھڑکن پر اُس نے ہاتھ رکھا اور محسوس کیا اُنہیں احساسات کو کاغذ کے صفحوں پہ دیوان کی شکل میں پیش کیا۔ تم نے شمع کو دیکھا ہے نا! ہر حال میں جلتی رہتی ہے۔ بزم طرب ہو یا ماتم کدہ، چاہے مزار پہ ہو یا حجلۂ عروسی میں۔ اُسے خوشی یا غم سے مطلب نہیں۔ اُس کا کام صرف جلنا ہے۔ ساری رات وہ جلتی رہتی ہے رات کے سینے میں پلنے والے دُکھ، گناہ، ثواب، عذاب سبھی کچھ وہ دیکھتی ہے۔ خاموش رہتی ہے۔ اُسے نہ ستائش کی تمنّا ہے اور نہ صلہ کی پروا۔ وہ اُس وقت تک جلتی ہے جب تک سحر کی دیوی آ کر اُسے سُلا نہ دے۔ زندگی کی مثال بھی ایسی ہی ہے وہ اُس وقت تک رہتی ہے جب تک موت کا آہنی پنجہ اُس کے قریب نہ آئے۔ زندگی کی شان اسی میں ہے کہ وہ خود کو حالات کے تابع کرے۔ وہ انسان جو زندگی کو ہر حال میں گزارتا ہے چاہے خوشی کے

اُس کے ساتھ ہوں یا تبسم کے پھول اُس کے دامن میں، وہی صحیح معنوں میں انسان ہے۔
انسان کی ہستی حباب کی مانند ہے۔ موت کا جھونکا آیا اور زندگی کا چراغ گل ہو گیا۔ غم دوراں
اور غم جاناں کو گلے لگا کر جینے والا صحیح معنوں میں جیتا ہے اور اُس وقت تک جیتا ہے جب
تک موت چارہ گر بن کر اُس کے غموں کا مداوا نہ کرے۔

سنو رعنا! تم نے اُس کے خیالات! میں اُس کے منہ سے یہ سب سن کر حیران رہ گئی۔
جیسے وہ خود کو فریب کے پیچھے دل میں پنہاں رکھتا ہے۔ میں نے بے اختیار پوچھ لیا۔

"آپ کے خیال میں شمع کی طرح جلنے والے مرد ہوتے ہیں یا عورت؟"

"یہ اپنے اپنے کردار کی بات ہے ندیم! بھلا حقیقتوں کا سوال ہے لیکن اتنا ضرور
ہے کہ شمع کی طرح جلنا عورت کے حصے میں زیادہ آیا ہے، مرد اس معاملے میں کچھ کم ہی پیش پیش
ہوا ہے، اتنا کہہ کر وہ چپ ہو گیا۔ میں بھی خاموش رہی اور سوچنے لگی کیا یہ ٹھیک کہہ رہا
ہوتا ہے؟ کیا یہی حقیقت ہے؟

اُس دن کے بعد میں نے محسوس کیا کہ لاشعوری طور پر میں اُس کے قریب پہنچ گئی ہوں۔
اور ایک دن نہ جانے کس جذبے کے تحت میں نے اپنے دل کو کاغذ کے صفحے پر منتقل کر دیا
میرا خط پڑھ کر وہ چپ ہو گیا۔ میں جواب طلب نظروں سے اُسے دیکھنے لگی۔

"اس کا جواب جلد ہی دوں گا" اتنا کہہ کر وہ اپنے کمرے میں چلا گیا اور پھر میں بے تابی
سے اُس دن کا انتظار کرنے لگی۔ میں نے محسوس کیا، ندیم کے بغیر میری زندگی ادھوری ہے تو
اُس کے بغیر سانس لینا بھی مجھے گوارا نہ تھا۔ لیکن خاندانی رسم و رواج کا خیال کر کے
میں چپ رہی۔ اسی انتظار میں ایک سال گزر گیا۔ ندیم نے بی کام کر لیا اور ایک اچھی سی
ملازمت بھی ہو گئی۔ میں بھی بی۔ اے کر چکی تھی اور اسی خوشی میں پاپا نے ایک شاندار پارٹی
دی تھی۔ پاپا کے کئی دوست پارٹی میں مدعو تھے۔ سب نے مجھے تحفے دیے اور پھر

میں چونک اٹھی جب پپا نے میرا تعارف الیاس سے کرایا۔
"ترنم! اِن سے ملو۔ یہ ہیں تمھارے چچا فخر احمد کے لڑکے الیاس احمد، فوج میں میجر ہیں۔"

میں نے دیکھا الیاس کافی اسمارٹ ہیں۔ لیکن رخشی! مجھے پتہ نہ تھا کہ میری تقدیر پپا نے اُن کے ساتھ منسوب کی ہے۔

ہاں تو میں کہہ رہی تھی ندیم کی بات! اُس روز سب کے ساتھ تحفے دیتے وہ بھی میرے قریب آیا اور ایک خوبصورت فریم میرے حوالے کیا۔ میں نے دیکھا یہ ایک تصویر تھی جس میں شمع کو پگھلتے ہوئے دکھایا گیا تھا اور نیچے غالب کا وہی شعر تھا۔ میں نے چونک کر دیکھا۔

"یہ کیا ہے ---- ؟" میں بے اختیار کہہ اُٹھی۔
"تمھارے خط کا یہی جواب ہے ترنم!" اتنا کہا اور واپس چلا گیا۔ میری سمجھ میں کچھ نہ آیا اور جب کچھ سمجھنے کے قابل ہوئی تو میرا سب کچھ لُٹ چکا تھا۔ میری زندگی کا امین الیاس کو بنا دیا گیا۔ میں نے ممّی سے کہا ---- "یہ رشتہ مجھ سے پوچھے بغیر آپ نے کیوں طے کر دیا۔"

"تمھیں تعلیم دلانے کا یہ مقصد نہیں کہ ماں باپ کو ہر معاملے میں تمھاری رائے لینی پڑے جو کچھ ہم نے کیا تمھارے بھلے کے لئے کیا۔ الیاس ہر لحاظ سے تمھارے قابل ہے۔ اگر اس فیصلے سے تمھیں انکار ہے تو پھر تمھیں ماں باپ کی جان سے ہاتھ دھونا پڑے گا کیونکہ ہمارے نزدیک عزت اور خاندانی وقار سے بڑھ کر اپنی جان نہیں۔" یہ تھا پپا کا وہ حکم جس کے آگے میں نے سرِ تسلیم جھکا دیا۔
تم ہی کہو رخشی! میں کر بھی کیا سکتی تھی۔ ایک طرف ماں باپ دوسری طرف ندیم!

ف فرض اور دوسری طرف محبت! اس ٹکراؤ نے مجھے ہمیشہ کے لئے زخمی کر دیا۔ میں جب
ہنسنا چاہتی ہوں ندیم کی نظریں مجھے یاد آجاتیں اور یوں محسوس ہوتا جیسے وہ کہہ رہا ہو۔
شمع ہے وہ ہر حال میں جلتی ہے!"
آخر وہی ہوا۔ میں زمانے کے رسم و رواج، خاندانی وقار، ماں باپ کی عزت
پر بک گئی۔ میں نے اپنے آپ کو بیچ ڈالا۔ رخصت کے وقت اوروں کی طرح ندیم بھی میرے
اور لوگوں کی نظریں بچا کر میری آنکھوں میں چھلکتے ہوئے آنسوؤں کو رومال میں جذب

ترنم! ان آنکھوں میں آنسو اچھے نہیں معلوم ہوتے۔ ان میں امید، ہمت اور استقلال
جلتے ہیں۔ یہ بندھن ہر لڑکی کے لئے ہے کوئی خوشیوں کے دھاگے میں اسے باندھتا
ئی آنسوؤں کی لڑیاں اپنے گلے میں ڈالتا ہے تم عورت ہو، زمانے کی وہ قابلِ فخر ہستی
کائنات کو جلا بخشی۔ جس کے وجود سے پھولوں میں خوشبو، چمن میں بہار، سورج
، چاند میں چمک پیدا ہوتی ہے۔ جس نے ہر زمانے میں سیتا اور مریم کا روپ
قسمت کا فیصلہ اٹل ہے تم یا ہم اس سے ٹکرا نہیں سکتے۔ میری نیک تمنائیں قدم
ملائے ساتھ رہیں گی۔ جیو تو اس شمع کی طرح جو خود جل کر دوسروں کو روشنی بخشتی

و سرخشی! ان الفاظ کو میں نے اپنے گلے میں پڑے ہوئے ان روایتی کلیوں کے تعویذ سا
باندھ لیا اور پھر یقین جانو قدم قدم پر ندیم کے الفاظ مجھے راہ دکھاتے رہے۔ الیاس
تھے لیکن ان کی محبت میں مجھے تسکین نہ مل سکی کیونکہ وہ مصروف ترین آدمی تھے
زیادہ ان کے نزدیک فرض کی اہمیت تھی۔ شراب سے انھیں پیار تھا۔ میں
پروا کئے بغیر ان کا ساتھ دیتی رہی۔ لیکن نتیجہ برعکس ہوا۔ تین سال بعد

وہ نہیں بدلے اور ان کا طرزِ تکلم بھی۔ میں نے کبھی دل کا زخم ظاہر نہ ہونے دیا۔ ماں باپ نے سمجھا بیٹی خوش ہے۔ انہوں نے دل سے نکلتے ہوئے اُس دھوئیں کو نہیں دیکھا جس میں میرا وجود گھُٹ کر رہ گیا تھا۔ صرف اتنی سی خطا پر کہ میں انہیں اولاد نہ دے سکی، وہ مجھ سے روٹھ گئے۔ میں نے ان کی خوشی کے لئے دوسری شادی کی بات کی تو وہ راضی ہو گئے۔ روبینہ دلہن بن کر آ گئی۔ اسی گھر میں جہاں کبھی میں نے شہنائیوں کی مدھر گونج میں قدم رکھا تھا۔ پپّا کو جب معلوم ہوا تو تاب نہ لا سکے اور کچھ کہے بغیر ہمیشہ کے لئے ہم سب سے روٹھ کر چلے گئے۔ اس وقت ممی کو ندیم سنبھال رہا تھا جو مردوں سے بدتر ہو چکی تھیں۔ ندیم! جو مجھے شمع کی طرح سلگ جلنے کی نصیحت کرتا تھا وہ خود اپنی آگ میں جل رہا تھا اسے تم ہی کہو رخشی! صبر عورت کرتی ہے یا مرد؟

ارے میں تو کہنا بھول گئی۔ سنو ۔۔۔ ! جب ندیم کو الیاس کے رویّے کی اطلاع ملی تو وہ میرے پاس آیا۔

"شبنم! میں نے سنا ہے الیاس کا رویّہ تمہارے ساتھ ٹھیک نہیں۔ کیا یہ سچ ہے؟"

"آپ سے کس نے کہا یہ تو بالکل غلط ہے!" میں مسکراتی ہوئی بولی۔

"شبنم! خود کو فریب کے پردوں میں نہ رکھو۔ اپنی شخصیت کو ایسا آئینہ نہ بناؤ! جس میں تمہاری دوسری شبیہ ابھرے۔ میں جانتا ہوں تم آگ میں جلنے لگی ہو" ندیم نے کہا۔

"نہیں نہیں ۔۔۔ نہیں!" میں چیخ اٹھی۔ میرے منہ سے خون بہہ نکلا۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ میرا غم کسی پر عیاں ہو کیونکہ ایسا ہونے میں میرے جذبات، میرے احساسات میرے خیالات کی توہین تھی۔ میں ندیم کے کہے ہوئے الفاظ کو اپنی زندگی کے ہر سانچے میں ڈھلنا چاہتی تھی۔ مجھے یاد نہیں رخشی! کہ اس کے بعد کیا ہوا! اتنا یاد رہ گیا کہ مجھے چکر سا

آنے لگا اور ندیم نے مجھے سنبھال لیا۔

اُس روز جب میری آنکھ کھُلی تو وہ شاید ساتواں دن تھا۔ ندیم میرے سامنے تھا۔ ڈاکٹر کہہ چکے ہیں کہ کینسر نے بُری طرح میرے سینے کو جکڑ لیا ہے اور ندیم کو اس بات کا غم تھا کہ اب تک میں نے ایسے مہلک مرض کو کیوں پناہ دی؟ اُس کے جواب میں نے اُسے وہ تصویر دکھائی جو اُس نے مجھے دی تھی۔ ندیم سر تھام کر رہ گیا۔

"ترنم! میں نے یہ تو نہ کہا تھا کہ تم شمع کی طرح جلو، سجدا یہ تو میں نے تمہیں اپنی تصویر دکھائی تھی لیکن یہ تم نے کیا کر دیا؟" ندیم میرے آگے پھوٹ کر رو پڑا۔ بالکل اُس بچے کی طرح جو اپنے کھلونے کو کسی اور کے ہاتھ سے ٹوٹتا دیکھ کر بلک پڑتا ہے۔

رخشی! آخری بات اور سُن لو۔ کل میرا آپریشن ہے۔ لیکن جانتی ہو ڈاکٹروں نے کہا ہے؟ وہ کل ندیم سے کہہ رہے تھے کہ آپریشن میرے لئے بلا لیعوا ثابت ہو سکتا ہے کیونکہ سانس کی نالی پوری طرح متاثر ہو چکی ہے۔ لیکن ندیم ڈاکٹروں کی منت سماجت کر رہا ہے اُسے کیا پتہ کہ میری زندگی کی شام آ چکی ہے اور موت کی صبح میرا انتظار دیکھ رہی ہے۔ رخشی! مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ میں نے شمع کی طرح جینا سیکھا اور اُس وقت جلتی رہی جب تک موت کی سحر مجھے سُلا نہ دے۔ اب فیصلہ تم پر ہے۔ تم بتاؤ شمع کی طرح جلنا عورت کے حصے میں آیا ہے یا مرد کے!

اچھا اب رخصت — الم نصیب ترنم

(بیسویں صدی، اپریل ۱۹۷۰ء)

دستِ حنا

"شمو باجی ... شمو باجی ... دیکھئے تو رتنا کی برات آئی ہے۔ چلئے نا! ہم بھی دیکھیں گے۔" نگار کمرہ میں داخل ہوتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

وہ جنگل کی طرف کھلنے والی کھڑکی کی طرف منہ کئے کھڑی تھی۔ سُرخ دوپٹہ شانوں پہ لہرا رہا تھا۔ ناگن کی طرح بل کھاتی ہوئی لانبی سی چوٹی پشت کے حُسن کو دوبالا کر رہی تھی۔ نگار کی آواز پر اس نے مڑ کر دیکھا۔ ایسے محسوس ہوا جیسے قوس و قزح کے سارے رنگ یکجا ہو گئے ہوں۔

"ارے چلو بھی"... نگار اسے گھسیٹنے لگی۔

"آتی ہوں بابا .... ذرا سنبھلنے تو دو" اس نے الجھی لٹ دُرست کرتے ہوئے کہا .... !

"کیسے بتاؤ گی سنو نکر چلو نا جلدی !"۔ نگار نے نادانی سے کہا۔ وہ عجلت میں تھی۔

"کیسے بتاؤ گی — ؟" یہ جملہ دُہراتے دُہراتے جیسے کھو سی گئی۔

"کیا ہو — ؟ کیا سوچ رہی ہو" نگار نے اسے جھنجھوڑا۔

"اوں ـــــ کچھ نہیں چلو چلیں۔" وہ پیر میں چپل ڈالے باہر نکل گئی۔ دونوں پھاٹک کی طرف نکلے۔ کمپاؤنڈ کی دیوار کے سہارے کھڑے ہو کر رمّا کی برات دیکھنے لگیں۔ برقی قمقمے جگمگا رہے تھے۔ بینڈ باجہ بج رہا تھا۔ دُلہا پھولوں سے سجی گاڑی سے اترا۔ اس کے چہرے پہ سہرے کی لڑیاں تھیں۔ نگار اچھل اچھل کر یہ تماشہ دیکھ رہی تھی۔ اور شمع تو بس شمعِ خاموش بنی کھڑی تھی۔ اس کی نظروں میں آج سے تین سال پہلے کا دور گھومنے لگا۔ اسے یاد آیا کہ وہ بھی دلہن بنی تھی۔ اس کے ہاتھوں میں بھی مہندی کے گل بوٹے سجائے گئے تھے۔ گہنوں نے اسے سنوارا، سرخ کپڑوں نے اسے شعلوں کی طرح دہکا دیا۔ بس کسی نے ہاتھ لگایا اور جل گیا! اس کی سہیلیاں اسے چھیڑ رہی تھیں۔ وہ مسکراتی رہی جیسے پھلجھڑیاں چھوٹ رہی ہوں۔ دفعتاً ایک زلزلہ آ گیا۔ دلہا مسند سے اٹھ گیا۔ سہرے کے پھول تڑپ کر رہ گئے۔ سرخ کپڑے کملا گئے۔ اور دستِ حنا مرجھا گیا۔ ریاض نے عین نکاح کے وقت اس لئے انکار کر دیا کہ اسے اسکوٹر نہیں دی گئی۔ میں کار کا آرزومند تھا۔ شمع کے بابا نے منت سماجت کی، اپنا دامن پھیلایا لیکن اندھے گاہکوں نے اس ہیرے کو خریدنے سے انکار کر دیا۔ شمع دلہن تو بنی مگر سہاگن نہ بن سکی۔ بینڈ والوں نے بہت ہی پُر درد گیت چھیڑا۔

بابل کی دعائیں لیتی جا، جا تجھکو سکھی سنسار ملے
میکے کی کبھی نہ یاد آئے سسرال میں اتنا پیار ملے

وہ اپنے خواب سے چونک گئی۔ اس کی نظر اپنے ہاتھوں کی طرف اٹھ گئی جن کی گلابی رنگت حنا کو بھی شرما رہی تھی۔ خوبصورت ہتھیلیوں پہ ابھرا ابھرا سا گوشت، لانبی لانبی مخروطی انگلیاں، "کیا ان پہ کبھی رنگ حنا چڑھے گا ـــــ ؟" اس کے دماغ نے سرگوشی کی۔ اس نے اپنی مٹھیاں کس لیں۔

"چلو نگار اندر چلیں" اس نے نگار کے شانے پہ ہاتھ رکھ کر کہا۔ برات جا چکی تھی۔ وہ دونوں اندر داخل ہو گئیں۔

"میں پوچھتی ہوں، کہاں گئی تھیں تم دونوں —— ؟" اپنی چچی کی گرجدار آواز سے دہل گئی۔

"ممی رما کی بارات آئی تھی نا! اسی لئے دیکھنے گئی تھی" نگار نے ماں کو سمجھایا۔

"برات رما کی تھی اور شوق تم کو چرایا دیکھنے کا ؟ شرم تو کرو! ایک تو ہماری جان پہ نواب بن کر بیٹھی رہو اور دوسرے یوں سڑک پر تماشہ بننے کیوں چلی جاتی ہو؟" چچی کی آواز تیز ہوتی جا رہی تھی۔

"چچی! ——" وہ ننھا سا ہاتھ ان کی آواز کو روکنے کیلئے اٹھا کر رہ گئی۔

"چپ رہ کم بخت! ہمارا تو جینا دو بھر کر دیا ہے۔ کسی کے پاس جاتے ہوئے شرم آتی ہے۔ نہ جانے کس جنم جلی کو میرے پلے باندھوا گئے مرنے والے۔ اگر آنکھ مٹکے کا شوق ہے تو میرے گھر کے دروازے اپنے لئے بند سمجھو۔" چچی کا غصہ تھمتا ہی نہ تھا۔

"ممی! شمو باجی کو تو میں ہی لے کر گئی تھی۔ آپ ان پر کیوں بگڑ رہی ہیں۔" نگار نے مداخلت کی۔

"چل ہٹ! یہاں سے۔ بڑی آئی شمو باجی کی طرفدار بن کر۔ یاد رکھو نگار! اگر تم نے بھی دوسروں کی طرح اپنا قدم آگے بڑھانا شروع کیا، تو مجھ سے برا کوئی نہ ہو گا۔ نہ جانے کیا دیکھا تھا کسی نے جو مہندی لگ کر چھوٹ گئی ——" چچی تو اتنا کہہ کر اندر چلی گئیں اور شمع ساکت و جامد کھڑی کی کھڑی ہو گئی۔ ایک ایک لفظ تازیانہ بن کر اس کے دل پہ برستا رہا۔ آنسو اس کے گالوں کا صدقہ اتارتے رہے۔ اس کی سسکیاں فضا میں تیز ہو گئیں۔ دفعتاً اس کے سر پہ کسی نے ہاتھ رکھا۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ اس کا پیارا چچا

اس کے سامنے تھا۔

"نہ رو میری بچی"! چچا کے منہ سے مدھم سروں میں نکلا۔

"چچا!" ــــــ شمع کا سارا غم اس ایک لفظ پہ لاوا بن کر بہہ نکلا۔ وہ بلک پڑی۔

"میں پوچھتی ہوں یہ آنسو کس کے لئے بہائے جا رہے ہیں۔ تمہیں کوئی اور کام نہیں؟ ہزار بار کہا اپنی چار سمجھا لو" مگر تم نے تو گھر کی ہر بات کا ٹھیکہ لے رکھا ہے۔! ہر وقت مداخلت "ہونہہ!" اس کی چچی نے اپنے شوہر پہ بگڑتے ہوئے کہا۔

"بیگم! خدا سے ڈرو! کیوں یتیم کا دل دکھاتی ہو" بمشکل تمام وہ اتنا کہہ سکے۔

"بس بس! تمہاری تقریر کی مجھے ضرورت نہیں۔" وہ ہاتھ ہلاتی ہوئی یہ کہہ کر چلی گئیں۔ شمع اپنے کمرہ کی طرف بڑھ گئی۔

صبح کے نو بج رہے تھے۔ وہ آفس جانے کی تیاری کر رہی تھی۔ کپڑے بدل کر جب اس نے چچی سے جانے کی اجازت مانگی تو وہ فوراً کہہ اٹھیں

"آج پہلی تاریخ ہے۔ خیال رہے کوئی مفت کی روٹیاں نہیں دیتا اس زمانے میں۔ کمائی کھانے کے لئے ہوتی ہے سنورنے کے لئے نہیں!" وہ پھر ایک بار تلملا گئی۔ اس نے بالوں سے گلاب کا وہ پھول نکال کر پھینک دیا جو لگا زبردستی لگا کر گئی تھی۔ وہ گیٹ سے باہر نکل گئی۔

"کاش بابا زندہ ہوتے ــــــ چلتے چلتے اس کے دل نے کہا۔ وہ سوچنے لگی ــــــ اس کی زندگی نے جتنی بہاریں دیکھیں سب کی سب خزاں بداماں تھیں۔ چند ابھوتے

ہی ماں نے آنکھیں بند کیں، دلہن بنتے ہی باپ نے منہ پھیر لیا۔ بچپن ممتا کی تشنگی سے دو چار تو شباب شفقت سے محروم!

"شمع"! وہ اپنے نام کی گہرائی میں ڈوب گئی۔ جلنا اور سلگنا بس یہی دو کام ہیں اس کی زندگی کے! بس اسٹاپ آچکا تھا وہ بس میں سوار ہو گئی۔ ماضی کی دنیا پھر ایک بار اس کے سامنے آ گئی۔ اسے یاد آیا! بابا کے مرنے کے بعد چچا نے کتنی اپنائیت سے اسے اپنے گھر بلایا اور پہلی بار گھر میں قدم رکھتے ہی اسے چچی کی کرخت آواز سنائی دی۔ "یہ گھر کوئی یتیم خانہ نہیں جو ہر آنے جانے والے کو پناہ دے۔" اس کا دل بھر آیا۔ اسے وہ بھی یاد تھا جب ایک صبح اس کا چچا آنگن میں بے ہوش پڑا تھا۔ ڈاکٹروں کی رائے یہ ہوئی کہ اس کے پیر مفلوج ہو چکے ہیں۔ چچا کی بیماری کے بعد اس نے نوکری سنبھالی۔ گھر کا سارا بار اب اسی کے سر تھا۔ وہ ایک ٹھنڈی سانس بھر کر سوچنے لگی۔ کیا اس کی زندگی یوں ہی گزر جائے گی؟ دفعتاً اس کے خیالات کی ڈور ٹوٹ گئی۔ اس کی بازو والی سیٹ پر بیٹھے ہوئے نوجوان نے اس کا گرا ہوا پرس اس کے حوالے کیا۔

"اوہ شکریہ"! وہ چونک کر کہہ اٹھی۔

"کوئی بات نہیں! آئندہ احتیاط کیجئے۔ جاگتے خواب خطرناک ہوتے ہیں!" نوجوان نے کہا۔

"بیدار کرنے کا شکریہ" وہ سنجیدگی سے کہہ کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔ اس کا دایاں ہاتھ اس کے گالوں پر تھا۔

"آپ کہاں جائیں گی مس شمع"؟ نوجوان نے سوال کیا۔

جی ــــ آپ کو میرا نام کیسے معلوم ہوا؟" وہ حیرانگی سے پوچھنے لگی۔

"ہم تو صورت دیکھ کر کہہ دیتے ہیں۔ دیکھئے نا! شمع تو بہت خوبصورت لیکن جلتی رہتی ہے۔ ذرا سا ہاتھ لگا یا اور بس آگ لگ گئی۔ میں نے ہمدردی جتائی اور آپ نے اپنی بے مروتی سے چہرہ پھیر لیا۔ آپ کی اس انگوٹھی نے مجھے چوری کی ترغیب دی۔" نوجوان نے اس کی دائیں ہاتھ کی انگلی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"اوہ ——!" اس نے اپنی انگلی دیکھی۔ انگوٹھی پہ شمع لکھا تھا۔

"آپ بہت دلچسپ ہیں"! اس نے مسکرا کر کہا۔

"معاف کیجئے میں نوید انجم ہوں۔ انڈین ایر فورس میں کیپٹن ہوں۔ آج کل چھٹی پہ ہوں۔ دل کے بہلانے کے لئے گھومتا رہتا ہوں۔ کبھی بس میں کبھی ٹرین میں، کبھی پلین میں۔ نوید نے تعارف کروا دیا۔

"بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر! میں قریبی آفس میں اسٹینو ٹائپسٹ ہوں۔" شمع نے کہا۔

"لیکن آپ ٹائپسٹ کم اور معصوم قاتل زیادہ نظر آتی ہیں۔ معاف کیجئے میں ذرا صاف گو آدمی ہوں۔ آپ نے کبھی آئینہ دیکھا ہے؟ نوید اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔

"بڑے شریر ہیں آپ"! تین سال بعد وہ پہلی بار کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ بس ایک جھٹکے کے ساتھ رکی۔ اس کا آفس آ چکا تھا وہ اتر پڑی۔

یہ تو تھی نوید اور شمع کی پہلی ملاقات۔ اس کے بعد یہ سلسلہ دراز ہوتا ہی گیا۔ شمع کو نوید کی باتوں میں جینے کی راہ نظر آتی تھی۔ چاچی کی ٹھکرانے کے بعد نوید کے پرخلوص جملے مرہم کا کام دیتے۔ جیسے آگ بجھانے کیلئے پانی میسر آ گیا ہو۔ وہ نوید کے بارے

میں گھنٹوں سوچتی رہتی۔ نوید امیر باپ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اور وہ غریب باپ کی بیکس بیٹی۔ کتنا بڑا تضاد تھا یہ ـــــ وہ جانتی تھی کہ نوید کی محبت کا رنگ اگرچہ اس کے دل پر چڑھ چکا ہے۔ لیکن اس کے سہاگ کی مہندی اس کے ہاتھوں پر کبھی چڑھ نہیں سکے گی۔ نوید کے الفاظ اسے بار بار یاد آتے۔ ایک دن اس نے سمیعہ کا گداز ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر کہا تھا۔

"ریاض نے حسن حنا کو تمہارے لہو سے جھوم شہ ادا طوفان کے خون سے رنگین بنایا ہے میں اسی حنا کو اپنی محبت کے رنگ میں شامل کر کے تمہاری ہتھیلیوں پر گل بوٹے بناؤں گا۔ جس کی ہر پتی پر نوید لکھا ہوگا۔ تمہاری آنکھوں کے جلتے ہوئے دیئے اب تمناؤں کی مزار پر رکھے جائیں گے۔ تمہارے لبوں کے سکوت میں اضطراب ہے میں اس کو نغموں میں بدل دوں گا۔ میں تمہاری زلفوں میں پناہ چاہتا ہوں۔ بالوں کا یہ سایہ میرے لئے وقف کر دو۔ آنسوؤں کا یہ ساغر مجھے دیدو۔ تمہاری زندگی کا سارا غم ان سرمگیں آنکھوں کا صدقہ اتارتے ہوئے میرے حوالے کر دو۔ میں اس شراب کو پی لوں گا۔ تمہارے غم کو اپنا لوں گا۔ اس کے بعد تم سورج کی پہلی کرن بن جاؤ گی۔ چمن کی پہلی بہار بن جاؤ گی پھول کی خوشبو بن کر فضا کو معطر کر دو گی۔ میری زندگی کی طویل راہوں میں تمہیں ہمسفر بنانا چاہتا ہوں۔ ایک بار صرف ایک بار مجھے اپنا لو۔" ـــــ اور اس نے بے پناہ چاہت سے اس کے ہاتھ اپنی آنکھوں پہ رکھ لئے۔

پھر نوید کی چھٹیاں ختم ہو گئیں وہ رخصت ہو گیا اس کے دامن میں ہزاروں امید کے دیئے جلا کر۔ وہ آنسوؤں کی بوندیں ٹپکا ٹپکا کر انہیں جلاتی رہی۔ دن گزرتے رہے اور لمحے سرکتے رہے۔ ایک طوفانی شام کو اس کے چاچا نے ہمیشہ کیلئے آنکھیں بند کرنے سے پہلے ایک بار اس کی آنکھوں میں گھور کر دیکھا اور کہا بیٹی! میں نے . . . . اس گھر میں

..... تجھے لاکر ..... کبھی سکھ سے نہ رکھا ..... بھائی صاحب کی ..... آخری آرزو ..... میری بھی آرزو ..... بن گئی ..... میں تجھے دلہن نہ بنا سکا ..... مگر میری بچی تیرے ہاتھوں میں مہندی ضرور لگے گی ۔ ـــــــ میری ایک خواہش ضرور پوری کرنا ..... نگار کو وداع کرنے کے بعد ..... اپنے ہاتھوں کو سنوارنا ۔

..... یہ فرض تیرے ہی ذمہ سونپ رہا ہوں !!" جملہ ختم کرتے ہوئے ان کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی ۔ چچی اور نگار کی دل خراش چیخوں نے ماحول کو لرزا دیا اور وہ ـــــــ وہ مرنے والے سے بہت پہلے ہی مر چکی تھی ۔ جو خود ہی زندہ لاش ہو وہ کسی کی موت پر کیا آنسو بہائے ۔ اس نے تڑپتی ہوئی نگار کو سینہ سے چپٹا لیا ۔ جیسے چچا سے کیا ہوا وعدہ نبھانے کا عہد پورا کر رہی ہو ۔

دن گزرتے دیر نہیں لگتی ۔ کسی کی موت سے زندگی کے کاروبار ختم نہیں جاتے کچھ ہی کیوں نہ ہو زندگی کی گاڑی ٹیڑھی میڑھی پٹڑیوں پر آگے ضرور بڑھتی ہے ۔ شمع گھر کے افراد کو اپنی لو سے راستہ دکھا رہی تھی ۔ چچا کا چھوڑا ہوا مکان انہیں کے علاج کیلئے لئے گئے قرض میں بندھ چکا تھا ۔ گزر بسر کیلئے صرف شمع کی آمدنی ہی کا سہارا کافی تھا ۔ چچی کی طبیعت نے بھی بہت الٹ کھا موڑ لیا ۔ شاید یہ قدرت کی کرشمہ سازی تھی کہ بگڑے ہوئے دنوں نے انہیں انسان بنا دیا ۔ حالات کی ستم ظریفی ، شوہر کی موت نوجوان لڑکی کی شادی کا مسئلہ ، تنگئ معاش نے انہیں خوب خوب چرکے لگائے ۔ اور وہ چچی کی جگہ ہمدرد چچی ہو گئیں ۔ شمع کو دیکھے بغیر اب وہ رہ نہ سکتی تھیں ۔ شمع ان کی غیر معمولی تبدیلی پر حیران ضرور تھی ۔ ساتھ ہی خوش بھی تھی کہ برسوں بعد ماں کی جگہ پر پھر سایہ تھی ۔ اتنی تنگی کے باوجود شمع نے نگار کی تعلیم برابر جاری رکھی ۔ نگار کی عمر چڑھتے سورج کی تھی ۔ دیکھتے دیکھتے شباب کی منزلوں میں آ پہنچی تھی ۔ شمع نے نوید سے ملنا بھی چھوڑ دیا تھا ۔

کبھی کبھار وہ اس سے مل لیتی۔ ہر بار اس نے نوید کو یہ کہہ کر ٹال دیا کہ "مجھے پانا ہے تو انتظار کی شمعیں جلائے رکھنا! تم جلدبازی سے کام لوگے تو مجھے کھونا پڑے گا۔" اور نوید شمع کے اس جملے پر ہار مان لیتا۔ وہ چاہتا تھا کہ شمع کی مالی طور پر امداد کرے۔ لیکن شمع خوددار لڑکی تھی۔ اس کی غیرت یہ گوارا نہ کرتی تھی کہ اس کا محبوب اس کی غریبی پر ترس کھا کر اسے قابلِ رحم سمجھے۔ نوکری کے ساتھ ساتھ وہ ٹیوشن بھی کرتی تھی۔ جہاں تک ممکن ہو وہ اپنے چچا کی آخری خواہش جلد سے جلد پوری کر دینا چاہتی تھی۔ اسے ڈر تھا کہ نوید کی محبت میں کھو کر وہ اپنے فرض سے غافل ہو جائے گی۔ اس لئے اس نے دل پر پتھر رکھ کر نوید سے ملنا کم کر دیا۔

انہیں دنوں شمع کی کوششوں سے نگار کیلئے ایک رشتہ آیا جس کی چچی نے کہا۔ "شمع کی موجودگی میں نگار دلہن نہ بنے گی۔"

"چچی! جو کام بن رہا ہے بن جانے دو نگار دلہن۔ شمع کیلئے نگار کا راستہ نہ روکیئے آپ کو میری قسم۔ میں نے چچا سے وعدہ کیا ہے۔ اگر اسے پورا نہ کر سکی تو مجھے جینے کا حق نہیں ـــــ" شمع نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔ اس کی چچی چپ ہو گئیں۔

شمیم احمد کے لڑکے نسیم احمد کیلئے نگار کا رشتہ آیا تھا۔ لیکن لڑکی پسند کرنے کے باوجود ان لوگوں نے چند شرائط پیش کیں۔ جو ان سے پوری نہ ہو سکتی تھیں۔ اس دن دفتر سے لوٹنے کے بعد شمع نے چچی سے پوچھا کہ "لڑکے والوں نے کیا جواب دیا؟"

"بیٹی! یہ لوگ بھی چوڑی شرطیں پیش کر رہے ہیں۔ بھلا ایسے منگتے والوں کو ہم کیا دیں گے چھوڑو انہیں۔ قسمت میں رہے تو کوئی نہ کوئی مل ہی جائے گا" اس کی چچی نے جواب دیا۔

"نہیں چچی! ـــــ میں خود ان سے مل کر بات کروں گی۔ لڑکا بہت اچھا ہے

نگار خوش رہے گی۔ آپ فکر نہ کیجئے میں سب طے کر لوں گی۔ شمع نے کھانا چھوڑ دیا اور ہاتھ دھو کر کپڑے بدلنے چلی گئی۔ گھر سے نکل کر وہ سید شمیم احمد کے گھر پہنچی۔ وہ برآمدے ہی میں بیٹھے تھے۔

"تسلیم!" شمع نے سر جھکا کر کہا۔

"جیتی رہو! کیا تم اختر الزماں کی بھتیجی ہو۔" انہوں نے چشمے کی اوٹ سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں ——"

"آؤ آؤ بیٹھو۔ کہو کیسے آنا ہوا ——" انہوں نے اخبار میز پر رکھتے ہوئے پوچھا۔

"بات یہ ہے کہ آپ کے صاحبزادے نسیم احمد کی نسبت میری بہن کے لئے آئی ہے۔"

"لڑکی کو پسند کیا جا چکا ہے۔ لیکن شادی کی شرائط کی فہرست بہت طویل بتلائی گئی ہے" شمع نے کچھ رکتے جھجکتے بات کہدی۔

"ہاں ——" انہوں نے ایک لمبی سی آواز نکال کر کہا۔

"آپ تو جانتے ہیں کہ چچا کے انتقال کے بعد ہمارے معاشی حالات پہلے کی طرح نہیں رہے۔ نگار کو ہم اپنی حیثیت کے مطابق ضرور دیں گے۔ لیکن ہمارے مقدرت سے زیادہ مانگ ہمارے لئے ناقابل تکمیل ہوگی" شمع نے کہا۔

"وہ تو صحیح ہے لیکن لینا دینا تو شادی میں چلتا ہی ہے۔ اور پھر میرے ایسے کیتے نکے ہیں۔ لے دے کے صرف دو ہی ہیں۔ جن میں ایک تو نہ ہونے کے برابر ہی ہے" کہتے کہتے وہ کچھ آبدیدہ ہو گئے۔

"کیوں؟" شمع نے سوال کیا۔

"میرا بڑا لڑکا اعجاز کینسر کا مریض ہے۔ شہر کے تمام ڈاکٹروں نے ناامیدی ظاہر کی ہے۔ اس بیماری سے وہ ذہنی طور پہ بہت زیادہ مفلوج ہے۔ ڈاکٹر کہتے ہیں کہ ہو سکتا ہے کہ شادی کے بعد اس کی دماغی حالت بدل جائے۔ اور وہ آپریشن کے قابل ہو جائے۔ لیکن اسے لڑکی کون دے گا؟ کتنی منتوں کے بعد خدا نے اسے دیا۔ لیکن قسمت کی کرم فرمائی کہ ایسے مہلک مرض کا شکار ہے۔ اس کی ماں یہ چاہتی ہے کہ نسیم کا بیاہ رچا کر اپنے ارمان نکال لے۔" نسیم احمد کہتے رہے۔ وہ سر جھکائے سنتی رہی۔ دفعتاً اس نے سر اٹھایا۔

"اگر انہیں شریک حیات مل جائے تو کیا وہ اچھے ہو جائیں گے؟" شمع نے سوال کیا۔

"ڈاکٹروں کا تو یہی خیال ہے۔ ہو سکتا ہے رفیق زندگی کا ساتھ اس کے دکھ کا مداوا ہو جائے۔ اس کی ذہنی حالت سدھر جائے تو اس کا آپریشن کامیاب ہوگا۔" انہوں نے جواب دیا۔

"کیا آپ مجھے بہو بنا سکیں گے؟" شمع نے نظریں جھکا کر کہا۔

"کیا ۔۔۔؟" نسیم احمد اپنی جگہ سے اچھل پڑے۔ "تت ۔۔۔۔ تم اس بیمار سے شادی کرو گی ۔۔۔۔؟" وہ کچھ حیرت اور کچھ خوشی کے ملے جلے جذبات پر قابو پاتے ہوئے بولے۔

"جی ۔۔۔" شمع نے ہلکا سا سر کو خم کر کے کہا۔

"لیکن ۔۔۔۔ لیکن ۔۔۔۔ کیا تم سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کر رہی ہو؟" انہوں نے سوال کیا۔

"جی ہاں - اگر میری وجہ سے وہ ٹھیک ہو جائیں تو یہ میری خوش نصیبی ہو گی" شمع نے کہا۔

"لیکن بیٹی تم جانتی ہو وہ کینسر کے مریض ہیں۔ آپریشن اس کی جان بھی لے سکتا ہے۔ تم کیوں اپنے آپ کو تباہی کی طرف لے جا رہی ہو؟" ان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

"تباہی ——— ؟ گھر آباد کرنا تباہی ہے؟ اگر میری قسمت میں سہاگن رہنا ہے تو وہ ضرور اچھا ہو جائیں گے۔ آپریشن کے ٹیبل سے بھی میری قسمت انہیں کھینچ لائے گی۔ جلتے ہوئے دیوں کی لو پر تو ہر پروانہ ہی رقص کرتا ہے۔ مگر بجھتی ہوئی شمع کا طواف کرنا پرستش کا حسین انداز ہے۔ ہنسنے والے کے ساتھ تو زمانہ ہنستا ہے۔ لیکن رونے والے کے آنسو پونچھنے کیلئے کوئی اپنا دامن آگے نہیں بڑھاتا۔ زندگی تو وہی ہے جو دوسروں کے کام آئے۔" شمع الفاظ کے موتی لٹا رہی تھی اور نسیم احمد آنسوؤں کی بوندیں برسا رہے تھے۔

"میری بچی ——— اللہ تجھے سہاگن رکھے!" انہوں نے شمع کے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھ کر کہا۔

دوسری صبح شمع کی چچی حیران تھی کہ اچانک ہی بغیر کسی جھگڑا اور لین دین کے شادی کیلئے کیسے راضی ہو گئے؟

"خدا جانے تم نے ان پر کیا جادو کر دیا ہے۔ وہ تو لڑکی کو زرد کپڑوں ہی میں لے جانے کو راضی ہو گئے!" شمع کی چچی آنسو پونچھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"میں نے جادو نہیں کیا چچی - یہ تو ان کی قسمت کا کرشمہ ہے!"

وہ نوید کو خط پوسٹ کرنے جا رہی تھی۔ شادی کے دن قریب آ رہے تھے۔ شمع تیاریوں میں لگ گئی۔ اس نے اپنی حسب حیثیت نگار کو مناسب جہیز دیا۔ شادی سے چار دن پہلے شمیم احمد اس کے گھر پہونچے۔

"بیٹی! میں تم سے ایک درخواست کرتا ہوں۔!" انہوں نے کہا۔

"حکم دیجئے۔ میں کیا خدمت کر سکتی ہوں آپ کی!" اس نے سیاہ دوپٹہ سر پر ڈال کر کہا۔

"اعجاز میرے ساتھ آیا ہے وہ تمہیں دیکھنا چاہتا ہے۔ بہت مشکل سے شادی کیلئے راضی کیا ہے۔ کہتا تھا "کون ہے وہ مسیحا جو مجھے موت سے بچانے آیا ہے۔!" وہ بولے۔

"بلوائیے انہیں اندر ——" وہ اتنا کہہ کر بغل میں ہٹ گئی۔ شمیم احمد نے آواز دی اور وہ اندر داخل ہوا۔ دبلا پتلا سا نوجوان جس کے جسم کی ہڈیاں ابھر ابھر کر اپنا تعارف کرانا چاہتی تھیں۔ آنکھوں کے حلقے اس کی قسمت کی سیاہی کا ماتم کر رہے تھے۔ اس کی نظروں کی اداسی ماحول کو بھی لرزا رہی تھی۔ اس نے شمع کو دیکھا۔

"بابا —— کہیں آپ مذاق تو نہیں کر رہے ہیں؟" اس نے اپنے باپ سے پوچھا۔ کتنا کرب تھا اس کی آواز میں۔

"نہیں ——" شمع بول اٹھی۔ اس کا اٹھا ہوا ہاتھ اٹھا ہی رہا۔ اعجاز نے دیکھا خوبصورت گداز ہاتھ، لانبی لانبی مخروطی انگلیاں، جیسے سچ مچ مسیحا کی انگلیاں ہوں!

"کیا آپ سب کچھ جانتے ہوئے بھی ——" وہ رک گیا

"جی ــــ میں نے جو کچھ کہا ہے سوچ سمجھ کر۔ نہ کسی پہ رحم کی بنا و پر، نہ کسی طلب کی آرزو میں،" اس نے نظریں نیچی کر کے جواب دیا۔

"شکریہ! دعا کروں گا کہ زندگی مجھ سے وفا کرے" اعجاز کے چہرے پر، زندگی کی ہلکی سی کرن نظر آئی۔ وہ باہر نکل گیا۔

شادی کا دن آیا۔ نگار دلہن بنی سنوری اپنے پیا کے گھر چلی گئی۔ بغیر کسی "مانگ" کے اس کی مانگ افشاں سے بھر گئی۔ یہ صرف شمع، اعجاز اور شمیم احمد ہی جانتے تھے کہ کس نے کیا دیا اور کس نے کیا لیا ہے؟ ــــ اعجاز سیاہ رنگ کی شیروانی میں ملبوس، بالوں کو ڈھنگ سے سنوارے اپنے حسین مسیحا کو دیکھتا رہا اور زندگی کی ساری خوشیاں اس کے دامن میں بھرنے کے خواب سجاتا رہا۔ برات چلی گئی گھر سونا ہو گیا۔ شمع اپنے کمرہ میں چلی گئی۔ نوید کی یاد اسے آج رہ رہ کر تڑپاتی رہی وہ سوچنے لگی جب وہ اس کا خط دیکھے گا تو نہ جانے اسے کتنی بیوفا سمجھ لے۔ مگر شمع بےوفائی کرتی کہاں ہے۔ اسے چاہے محفل میں رکھ دو چاہے مزار پر خاموش سلگتی ہی رہتی ہے۔

رات بھیگ چکی تھی وہ بستر پہ دراز ہو گئی۔

نگار کی شادی کو دس دن گزر گئے۔ اب اس کے امتحان کا وقت آ رہا تھا۔ اس کی چچی خوش تھیں۔ انہیں حقیقت سے بےخبر رکھا گیا۔ بھری محفل میں شمع نے اعجاز کو قبول کیا۔ ہر آنسو نوید سے کئے گئے وعدوں کی ٹوٹی ہوئی مالا کی طرح گر رہا تھا۔ وہ مجبور بھی تو تھی۔ اعجاز کو نہ اپنا لیتی تو نگار کی زندگی میں بہار کیسے آتی؟ ایک چھوٹی سی قربانی اس کے خاندان کیلئے خوشیوں کے پھول مہکا رہی تھی۔ اس نے اپنے کعبۂ دل کے ٹوٹنے کا غم نہ کیا۔ صبر کا پتھر سینہ سے لگائے، حوادثِ زمانہ کے تیر کھانے کو تیار ہو گئی

ایک طرف اپنی بہن کی مانگ کو سجانے کی فکر، دوسری طرف ایک بوڑھے باپ کی دم توڑتی ہوئی خواہش، تیسری جانب اعجاز کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو پار لگانے کا جذبہ۔ وہ بھنور میں پھنس چکی تھی۔ اس لئے ڈوبتے ہی کو زندگی جانا۔

شادی کے بعد اعجاز نے شمع کے چہرے پر ہمیشہ پھول ہی کھلتے دیکھے۔ ان مہکتی ہوئی بہاروں کے سائے میں اس کی زندگی پل رہی تھی۔ شمع تو مسیحائی کیلئے آئی تھی۔ پھر وہ مسکراہٹ کے مرہم کی بجائے آنسوؤں کا زہر اپنی آنکھوں میں رکھتی تو اعجاز کے دل کا زخم کیسے مندمل ہو سکتا تھا۔

دن ہفتوں کا روپ بدل کر مہینوں میں بدل گئے۔ جیسے فلک کے گوشہ میں مسکراتا ہوا ہلال رفتہ رفتہ بدر کامل بن جاتا ہے شمع اور اعجاز کی زندگی چاندنی کی طرح نکھر آئی تھی۔ اعجاز کی ذہنی حالت بہت سنبھل چکی تھی۔ ڈاکٹرز اس غیر معمولی تبدیلی پہ حیران بھی تھے اور خوش بھی۔ اسکے چہرے کی ہڈیاں اب گوشت سے پُر ہونے لگیں تھیں۔ آنکھوں کے گرد چھائے ہوئے سیاہ ہالے برس چکے تھے۔

ایک حسین شام کو باتوں ہی باتوں میں شمع نے اس سے پوچھا۔

"آپ آپریشن کب کروائیں گے ______؟"

"شمع تم نے بیٹھے بیٹھے یہ تیر کیوں پھینک دیا؟" وہ ایک دم سفید سا پڑ گیا

"کیوں؟ کیا بُرا کیا میں نے؟ دیکھئے تو اب آپ کی صحت میں کافی تبدیلی آ گئی ہے۔ آپ کے لئے تو آپریشن ضروری ہے۔ ڈاکٹر ورما کہہ رہے تھے کہ آپریشن کے بعد آپ بالکل اچھے ہو جائیں گے۔" شمع نے کہا۔

"شمع! میں جینا چاہتا ہوں۔ مجھے راہ میں لٹنے نہ دو۔" اس نے شدتِ جذبات سے شمع کے ہاتھ تھام لئے۔

"آپ گھبرانے کیوں لگے! میری چاہت میری اُلفت آپ کو مجھ سے دور نہ لے جا سکے گی۔ سچ تو یہ ہے کہ ہم ابھی راہ پر چلنا سیکھے ہیں۔ زندگی کی تمام تر رعنائیاں تو آپ کو آپریشن کے بعد ملیں گی۔ آپ کا آپریشن کامیاب ہوگا۔ آپ صحت مند ہو کر گھر لوٹیں گے۔ میں اس وقت دلہن بنوں گی۔ آرزوؤں کی مہندی ہاتھوں پہ سجاؤں گی۔ تمناؤں کے زیور سے خود کو آراستہ کروں گی۔ اور مسرتوں کے چراغ جلاؤں گی۔ نگاہوں کو پھول بنا کر آپ کی راہ میں بچھاؤں گی۔ اور پھر ہم زندگی کے لمبے سفر کیلئے نکل پڑیں گے۔" شمع نے اس کے سینے سے لگ کر کہا۔

"شمع! تم ٹوٹے خوابوں کے جزیرے میں مجھے لے جانے کی کوشش نہ کرو۔ وہاں آنسوؤں کے بادل چھائے ہوئے ہیں۔ میں زندگی کی حسین وادیوں کی سیر کرنا چاہتا ہوں۔" اعجاز نے خلاء میں گھورتے ہوئے کہا۔

"میرے سرتاج! میں آپ کو ہر خطرناک موڑ سے بچا لوں گی۔ آپ مایوس کیوں ہوتے ہیں۔ میری دعائیں آپ کے قدموں سے لپٹی ہوئی ہیں۔ کوئی کانٹا بھی آپ کو نہ چبھ سکے گا۔ آپ ایسا خیال دل سے نکال دیجئے۔" اس نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"شمع! نہ جانے بار بار میرا دل یہ کہتا ہے کہ میں آپریشن کے تھیٹر سے واپس نہ آسکوں گا۔" وہ کرب میں ڈوبی آواز سے بولا۔

"نہیں ـــــ میرا سہاگ، میری مانگ کی افشاں، میرا دستِ حنا یوں مٹنے کیلئے نہیں بنا۔ آپ میرے عزم کو تھام کر کھڑے ہو جائیے۔ زندگی کی یہ تھکن دور ہو جائے گی۔" شمع نے اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔ اعجاز چپ ہو گیا۔

اس گفتگو کے بعد ڈاکٹر ورما سے مل کر شمع نے آپریشن کی تاریخ مقرر کرلی

ڈاکٹر ورما کو صرف یہی خدشہ تھا کہ آپریشن کے دوران دماغی حالت بگڑ نہ جائے۔ اگر اعجاز کی ذہنی حالت اتنی اندازہ نہ ہوئی تو آپریشن کامیاب ہونے کے قوی امکانات ہیں
آپریشن تھیٹر پر سرخ رنگ کا بلب روشن تھا۔ دروازہ بند تھا۔ اندر زندگی اور موت کی کشمکش جاری تھی۔ شمع اور دیگر افراد آپریشن تھیٹر کے باہر موجود تھے۔ شمع بنچ پر بیٹھی تھی۔ اس کا ہاتھ ٹھوڑی کے نیچے رکھا تھا۔ یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے کسی نے پیمانہ لبریز کر کے رکھ دیا ہو۔ اس کی آنکھوں میں دور تک امید کے دیئے جلتے دکھائی دے رہے تھے۔ اس کی سانسوں میں آس کے پھولوں کی مہک تھی۔ وہ گھڑیال کی سوئیوں کی طرف دیکھتی ہوئی بیٹھی تھی۔ لمحے ایک ایک کر کے سرک رہے تھے۔ ٹک ٹک ... ٹک ٹک ... ٹک ٹک .... گھڑیال کی آواز کے ساتھ اس کا دل بھی دھڑک رہا تھا۔ دفعتاً وہ اپنی چچی کی آواز پر چونک گئی۔

"بیٹی! شمع! تم سے ملنے کوئی نوید صاحب آئے ہیں۔ میرے گھر آئے تھے میں نے اعجاز کی روداد سنائی تو وہ تم سے ملنے یہاں چلے آئے۔" شمع نے ٹھوڑی کے نیچے رکھا ہوا ہاتھ نکالا اور چچی کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔
"میں نے انہیں اندر آنے کیلئے کہا تھا۔ لیکن وہ کہتے ہیں پہلے تم سے اجازت لے لوں، تب وہ آئیں گے۔" چچی نے کہا۔
"میں ہی ملنے جاؤں گی ——" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے آنچل سر پر ڈالا، اور بوجھل قدموں سے آگے بڑھنے لگی۔ دور ہاسپٹل کے گیٹ کے پاس نوید کھڑا نظر آیا۔ فوجی وردی میں ملبوس وہ اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ دونوں کے درمیان چند گز کا فاصلہ رہ گیا۔ لیکن وہ محسوس کر رہی تھی کہ یہ زمین و آسمان کا فاصلہ ہے۔ ڈوبتی

شام اور طلوع سحر کا فاصلہ ہے۔ ـــــ شمع ہلکے نیلے رنگ کی ساڑی میں لپٹی چلی آرہی تھی جیسے سمندر کی تہہ میں چھپی ہوئی کوئی موج ہوا کے جھونکوں سے سطح پر ابھرتی، ڈوبتی ہو۔ نوید کی نظریں اس پر مرکوز تھیں۔ اس کی رگوں کا سارا خون پلکوں پر جم گیا تھا۔ وہ قریب آ چکی تھی۔

"آپ کب آئے ـــــ؟" اس نے نظریں اٹھائے بغیر پوچھا

"میں گیا ہی کہاں تھا شمع! اس پروانے کی طرح تمہارا ہی طواف کررہا تھا جو رات ہوتے ہی اپنی شمع پر نثار ہونے کے لئے آجاتا ہے!" نوید کی پلکوں سے ایک آنسو ٹپکا۔ زمین نے اسے جذب کرلیا۔ اس کے جملے میں چھپے ہوئے کرب کو شمع نے محسوس کرلیا۔

"آپ بھول رہے ہیں، میں ایک بیاہتا عورت ہوں۔" اس نے دل پر جبر کرکے کہہ ہی دیا۔

"میں جانتا ہوں۔ اور یہ بھی جانتا ہوں کہ تمہاری مجبوری نے تمہیں سہاگ کا یہ روپ دیا۔ میں تم سے تمہاری بیاہی ہوئی زندگی کا حساب مانگنے نہیں آیا۔ صرف اعجاز کی کیفیت سن کر اظہار ہمدردی کرنے چلا آیا۔ تم اسے جذبۂ انسانیت سمجھو یا مختصر ملاقات کیلئے تقریب!" نوید اشکوں کے بہاؤ کو روک کر بولا۔

"نوید! زندگی نے ابتدا ہی سے کانٹے دیئے ہیں۔ میں نادان تھی جو ایک پل کی بہار پر اپنا سب کچھ نچھاور کر بیٹھی۔ تم سے ملنے کے بعد میں یہ بھول چکی تھی کہ مجھے کچھ اور کام بھی باقی ہیں۔ زمانے کی ستائی ہوئی، اپنوں کے ہاتھوں لٹی ہوئی کلی کی طرح تمہارے دامن میں آگری۔ تم نے مجھے سنبھالا۔ لیکن میں نے بھول کی اپنے ساتھ تمہیں بھی دکھ کے گہرے سمندر میں ڈبو دیا۔ میں تم سے بھیک مانگتی ہوں نوید۔ مجھے معاف کردینا۔

میرے وعدوں کو فریب کا نام نہ دو۔ اسے ایک بے بس کی مجبوری سمجھ لو۔ آؤ دیکھو! میں آج زندگی اور موت کی کشمکش کا تماشہ دیکھ رہی ہوں۔ یہ ہاتھ جنھیں تم حنا کے رنگ سے سنوارنا چاہتے تھے، آج امید و بیم کے دامن کو تھامے ہوئے ہیں۔ میں نے اپنے سارے غم سہاگ کی بازی میں لگا دیئے ہیں۔ ان کا آپریشن کامیاب ہوگا تو میری زندگی کا نیا سورج طلوع ہوگا ورنہ... ورنہ" اس سے آگے وہ کچھ نہ کہہ سکی۔ الفاظ حلق تک آکر رک گئے اور آنسو پلک تک آکر تھم گئے۔

"نہیں شمع! ایسا نہ کہو! تمہارا سہاگ ضرور سلامت رہے گا۔" نوید نے کہا

"چلو اس دریچے پر چلو جہاں میری قسمت بننے والی ہے۔" شمع نوید کو ساتھ لے کر آگے بڑھی۔

آپریشن تھیٹر اب بھی بند تھا۔ سب کے سب ساکت و جامد کھڑے تھے۔ ہر ایک کے دل کی دھڑکن زندگی کا جام چاہتی تھی۔ ٹک ٹک... ٹک... ٹک ٹک گھڑیال کی سوئیاں گردش کرتی رہیں۔ ڈیڑھ گھنٹہ گزر گیا۔ اور پھر کھٹ کی آواز پر شمع نے چونک کر دیکھا۔ یہ ڈاکٹر ورما تھے۔ وہ تولیے سے ہاتھ پونچھتے ہوئے اس کے قریب پہنچے۔ ان کی سانس تیز چل رہی تھی وہ شمع کے پاس آکر رک گئے۔

"ڈاکٹر! میرے انتظار کا معاوضہ ——؟" شمع نے نظریں اٹھا کر سوال کیا۔

"میڈم! آئی ایم ساری! مجھے دکھ ہے کہ میں انجاز کو بچا نہ سکا۔ دماغی شریانیں پھٹ جانے سے وہ...." ڈاکٹر ورما رک گئے۔

"اتنے طویل انتظار کا اتنا مختصر جواب ڈاکٹر ——!" شمع نے کرب ناک انداز سے ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"آئی ایم ساری!" وہ شمع کی پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ شمیم احمد ناگا

نسیم اور نوید کی سانسیں اکھڑ گئیں۔ دل دہل اٹھے۔ اور فضا میں بجلی کی تڑپ کی آواز ابھر آئی۔ یہ ان کی سسکیاں تھیں۔

شمع نے ایک نظر سب کو دیکھا اور پھر نوید کی طرف مڑ کر کہا۔

"آؤ نوید! تمہیں ان سے ملاؤں" اس نے کنکھیوں سے نوید کو تاکا۔

"شمع! ہوش میں آؤ!" نوید نے اسے جھنجھوڑا۔

"چھوڑو مجھے۔ دیکھو میں دلہن بنوں گی۔ مجھے ان سے ملنا ہے!" شمع نے اپنے قدم پیچھے ہٹا لیئے۔ سر پہ آنچل ڈالا۔ اور آپریشن تھیٹر کی طرف بڑھ گئی۔ شیتل پیدا ہوا زندگی کی آواز دلیئے سر جھکا تھا۔ سفید چادر اس کے چہرے پہ ڈال دی گئی تھی۔ شمع آہستہ آہستہ شیتل کے قریب پہنچی۔ پھر اس نے چادر ہٹائی۔ سرخ سرخ خون اس کے چہرے اور گردن پہ پھیلا ہوا تھا۔

"نہیں ———!" اس کی دلدوز چیخ نے فضا کو دہلا دیا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے تکنے لگی۔ پھر اس نے اپنا ہاتھ اس سرخ خون پہ رکھ دیا۔ اس کی ہتھیلی پہ سرخ رنگ کے گل بوٹے بن گئے۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر دیکھا۔ ہتھیلی پہ خون کے دھبے تھے۔ دفعتاً وہ پیچھے ہٹی اور نوید کے قریب پہونچی۔

"دیکھو ——— دیکھو نوید .... یہ میرا دستِ حنا ہے۔ کتنے خوبصورت گل بوٹے ہیں ان میں۔ تم کہا کرتے تھے نا! حنا کے گل بوٹے سجا دو گے۔ دیکھو تو کتنے سارے پھول کھلے ہیں حنا کے! سرخ حنا کے! .... ہا ہا ہا .... ہا ہا ہا!!" وہ بے تحاشہ قہقہہ مار کر ہنسنے لگی۔

"شمع! شمع!" نوید کے ساتھ سب اس کی طرف دوڑے مگر وہ مسلسل ہنس رہی تھی۔ اپنے ہاتھوں کو دیکھ رہی تھی۔ ڈاکٹر ورما بھی آ چکے تھے۔ دو نرسوں نے

مل کر شمع کو سنبھالا۔ مگر وہ مچل رہی تھی۔ ڈاکٹر ورما اس کے قریب پہونچے۔ انھوں نے اسے غور سے دیکھا اور گردن کو خفیف سا جھٹکا دے کر مڑ گئے۔

"اس دکھ نے ان کے ہوش وحواس چھین لئے ہیں۔ یہ اپنا دماغی توازن کھو چکی ہے۔ سسٹر اسے ایمرجنسی وارڈ میں لے جاؤ۔ میں مینٹل ہاسپٹل کو فون کرکے گاڑی منگواتا ہوں۔ ڈاکٹر ورما یہ کہہ کر آگے بڑھ گئے۔ شمع دو نرسوں کے درمیان قہقہہ لگاتی چلی جارہی تھی۔ جاتے جاتے اس نے عجیب نظروں سے نوید کو دیکھا۔ اپنا ہاتھ اس کے گال پہ لگا دیا اور کہا

"دیکھو! یہ پھول ہیں! انہیں کھو نہ دینا۔ اور پھر بے تحاشہ ہنستی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ نوید نے سرخ خون کے دھبوں کو اپنی دستی سے صاف کیا۔ اسے آنکھوں سے لگایا اور عقیدت سے انہیں چوم لیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ دُور بہت دُور سے شمع کے بھیانک قہقہوں کی آواز آرہی تھی۔

(بیسویں صدی، جولائی ۱۹۷۱ء)

ویراں ہے میکدہ

میں نے کال بیل پہ اُنگلی رکھی اور چند ہی لمحوں بعد اندر سے ایک مترنم سی آواز آئی۔ "اندر آئیے۔" میں نے دروازہ ہلکے سے ڈھکیل دیا۔ اب میں ایک آراستہ ڈرائینگ روم میں تھا خوشنما پردے شاندار صوفہ سٹ دیواروں کے کناروں پہ رکھے بڑے بڑے گلدان، دبیز قالین، چھت پر لٹکتا ہوا فانوس جو ہوا کے جھونکوں پر جلترنگ بجا رہا تھا دیوار پر ایک جانب مرزا غالب کی قد آدم تصویر، دوسری جانب عمر خیام کی رباعی تصویر کے ساتھ تھی اور کھڑکی کے اوپری حصہ پہ ایک خوب صورت پینٹنگ۔ ایک لمحے کے لئے میں نے سوچا یہ جنت ارضی ہے اور نہ جانے میں کہاں کھو گیا۔ ایک رس گھولنے والی آواز نے مجھے تصوّر سے حقیقت کی دہلیز پر لا کھڑا کیا۔

"تشریف رکھیئے۔" اب میں نے جو نظر ڈالی تو بس دیکھتا ہی رہ گیا۔ مرزا غالب کا دیوان، عمر خیام کی رُباعی، مصور کی پینٹنگ جیسے ایک پیکر میں ڈھل گئی۔ سرتاپا گلشن ہی گلشن، زلفیں کاندھوں پہ جھکی ہوئیں گلابی دوپٹہ فرش کو چھوتا ہوا اس کے گلابی

قدموں پہ نچھاور ہو رہا تھا۔ سنگ مرمر پر گلاب کی دو کلیاں ان کے درمیان موتیوں کی قطار، ستواں سی ناک میں جگمگاتی ہیرے کی کیل، شفاف پیشانی پر الجھی ہوئی شریر لٹ اور ان سب سے زیادہ متاثر کرنے والے دو بڑے بڑے پیمانے جن میں گلابی ڈورے پڑے تھے میکدہ ہی میکدہ تھیں وہ آنکھیں۔ میں ان میکدوں میں جیسے ڈوب سا گیا۔

"فرمایئے ـــ" مندر کی گھنٹیاں سی بج اٹھیں۔

"ہم ... میں آفتاب جمال۔" میں بڑی مشکل سے کہہ سکا۔

"جانتی ہوں۔"

"سحر سے پہلے آفتاب ہی آ سکتا ہے۔" وہ مسکرا پڑی۔

"جی ـــ میں سمجھ نہ پایا۔

ڈیڈی نے مجھے بتایا تھا کہ آپ آنے والے ہیں۔"

"اوہ ـ" میں نے لمبی سانس کھینچی۔" میں جلد آنا چاہتا تھا مگر ..."

"بس نہ مل سکی" اس نے جملہ مکمل کر دیا اور میں ان میکدوں کے جام پینے لگا۔

"منی۔ چائے لے آنا" اس نے آواز دی۔

"اس تکلف کی کیا ضرورت ہے۔ میں تو دراصل اس ایگریمنٹ کو آپ کے حوالے آیا تھا۔ میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے اسے ٹیبل پہ رکھ دیجئے۔ غالباً آپ نے تمام شرائط پڑھ لی ہونگی"
وہ دوپٹے کو اپنی انگلیوں پر لپیٹتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"جی ... جی ہاں" میرا حلق تر ہو رہا تھا اور میں جانے کیوں لڑکھڑانے لگا۔

"مجھے امید ہے کہ آپ دوسرے کرایہ داروں کی طرح ہمیں تنگ نہ کریں گے

ڈیڈی تو کرایہ دار ایسا چاہتے ہیں جیسے کہ اپنا ہی کوئی ہو۔ مگر لوگ اس کا غلط مطلب نکال لیتے ہیں کبھی آئے دن کی فرمائشیں، وقت پر کرایے کی ادائیگی سے تامل، بے ضرورت لائٹ اور نل کا خرچ، آدھی آدھی رات کو بے وجہ گانا، فون کے لئے بار بار جھٹکے مارنا بہرکیف ڈیڈی تو مکان کرایے پر دینا ہی نہیں چاہتے تھے ہمارے اصرار پر دو سال بعد اب یہ آپ کے حوالے ہوا ہے۔ اس روم سے ملحق کمرہ ہی آپ کو دیا جا رہا ہے تاکہ گھر کا بٹوارہ نہ ہو، یکسانیت ہی رہے۔" وہ کہہ رہی تھی اور میں ایک ریزہ ریزہ کی طرح دیر سکیدہ سپر بٹر رہا چلا جا رہا تھا دفعتاً چائے کی پیالی کی کھنکھناہٹ نے مجھے چونکا دیا۔

"لیجئے چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔" اُس نے کہا۔

"اور آپ ——" میں نے منی کے ہاتھ سے پیالی لیتے ہوئے کہا

"شکریہ" میں پی چکی۔ اُس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں اور میں چائے پی رہا تھا گویا شراب دو آتشہ کا مزہ لے رہا تھا۔

"منی صاحب کو ان کا کمرہ دکھاؤ اور سامان رکھوا دینا۔" اُس نے منی کو آواز دی اور میں چائے کی پیالی رکھ کر کھڑا ہو گیا۔

مجھے اس گھر میں آئے پورا ایک ہفتہ گذر چکا تھا لیکن اس مدت میں صرف ایک بار مجھے اُس کے دیدار نصیب ہوئے اور وہ بھی اس وقت جب وہ اپنے گھر کے کھلے آنگن میں بال سکھا رہی تھی۔ چمکیلی دھوپ میں زلفوں کے یہ سرمئی بادل میرے دل پہ برس برس گئے۔ میں اُس کی ملازمہ منی کو ہموار کرنے کی کوشش میں تھا تاکہ اس تک رسائی ہو سکے۔ کیونکہ منی ہمہ وقت اُسی کے ساتھ رہتی تھی۔ نوابی صاحب صبح سویرے جاتے اور رات دیر گئے لوٹتے۔ تب تک وہ اور منی دونوں ہی اکیلے رہتے۔

ایک بار ایسا اتفاق ہو ہی گیا میں باہر جانے کی غرض سے تیار ہوا اور سیدھے مُنّی کے پاس چلا آیا۔

"مُنّی تمھاری بی بی جی کہاں ہیں۔ انھیں یہ چابیاں دینی ہے۔" میں نے بہانا تراشا۔

"آئیے ــــ" وہ مجھے اپنے ساتھ اس کے کمرے میں لے آئی۔ وہ بستر پر دراز تھی سیاہ ریشمیں زلفیں تکیئے پر بکھری ہوئی تھیں۔ ہلکے نیلے رنگ کے نائٹ گون میں وہ کوئی اپسرا لگ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں، ٹیپ ریکارڈ بج رہا تھا جگجیت سنگھ کی مخصوص آواز فضا میں رس گھول رہی تھی۔

ٹکرا ہی گئی میری نظر اُن کی نظر سے
دھونا ہی پڑا ہاتھ مجھے قلب و جگر سے

میں اس آواز اور حسین منظر کے طلسم میں کھو کر "واہ" کہہ اٹھا اس کی بند آنکھیں کھل گیئں اور میرے لبوں پہ بے ساختہ یہ شعر نکل گیا۔

کون اُٹھا یہ آنکھیں مل کے
جھیل میں کھل گئے پھول کنول کے

"آپ" میری آواز پہ وہ اٹھ بیٹھی، اس نے ٹیپ بند کر دیا۔

"شاعری اور موسیقی سے شاید آپ کو بھی لگاؤ ہے"۔ اس نے پوچھا۔

"فطرتاً حسن پرست ہوں اچھی شئے کو دیکھ کر اچھے شعر پڑھ لیتا ہوں اور موسیقی سے مجھے پیار ہے"

"اوہ تشریف رکھیئے۔ کہیئے کیسے آنا ہوا؟" اس نے بال یکجا کرتے ہوئے کہا۔

"میں باہر جا رہا تھا سوچا کمرے کی چابی آپ کے حوالے کرتا جاؤں"

"کسی پر اتنا اعتبار ٹھیک نہیں ــ وہ مسکرا کر مجھے دیکھے جا رہی تھی اور مجھے

واعظ کی توبہ توڑنے والی بات یاد آ گئی۔

"اعتبار پہ تو زندگی چلتی ہے مس ..." میں رُک گیا میں اس کے نام سے ناواقف تھا۔

"مجھے سحر کہتے ہیں ۔" جانے کیوں ایک سرد آہ گلابی کلیوں پہ لرز کر رہ گئی۔

"آپ تنہا رہتی ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں تو ___ ڈیڈی اور ممی میرے ساتھ ہوتے ہیں۔ ڈیڈی کہیں باہر چلے جاتے ہیں تو میں اکیلا پن محسوس کرتی ہوں، یہ ٹیپ ریکارڈر، یہ کتابیں میری مونس و دمساز ہیں۔"

"آپ کو مطالعہ کا شوق ہے ___؟" میں نے سوال کیا۔

"مطالعہ کا ___" وہ ٹک ٹکی باندھ کر کہہ اٹھی۔ "ہاں ہُوں مجھے سننا لگتا ہے مجھے صرف سننے کا شوق ہے پڑھنے کا نہیں ہے ناں؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں بابا جی۔ آپ صاحب سے بات کیجئے میں کافی لے آتی ہوں" جاتے جاتے کہہ کر اداسی چھوڑ کر باہر نکل گئی۔ مجھے تو بیٹھنے کا موقع ہی ہاتھ آیا۔

"آپ چاہیں تو میں آپ کو ہر روز اچھی اچھی کتابیں لا دیا کروں گا۔"

"میں نے کہا نا مجھے سننا پسند ہے پڑھنا نہیں۔" اس نے آنکھیں بند کر کے کہا۔

"کیا میں آپ کو سنا سکتا ہوں تو آپ سننا گوارا کریں گی۔" میں نے ہمت کر کے پوچھ ہی لیا۔

"جی۔ جی ہاں" وہ کہہ اٹھی۔

"تو سنئے گستاخی نہ ہو تو ایک شعر نذرِ خدمت کروں۔" میں خوشی سے جھوم اٹھا۔ حسن کی یہ التفات میرے لئے گوہر نایاب تھی۔ اس نے بڑے دلکش انداز سے سر کو جنبش دی اور میرے لب کھلے۔

ہم نے پالا مدتوں اپہلو میں ہم کچھ بھی نہیں
تم نے دیکھا اک نظر اور دل تمھارا ہوگیا

اُس کی پلکوں کی چلمن جھلملانے لگی۔
"شعر اچھا تھا" اُس نے کہا۔
"لیجئے ایک اور عرض ہے

تیری آنکھیں بھی مانگتی ہیں شراب
میکدے خود بھی جام پیتے ہیں!

اس بار میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں تاکہ اپنے لئے اقرارِ محبت دیکھ سکوں مگر اس نے نظریں جھکا لیں اور میں بے ساختہ کہہ اُٹھا۔

کافر تیری آنکھیں ہیں مئے حسن سے مخمور
تھوڑی سی محبت کی شراب اور پلا دے

اسی عرصے میں وہ کافی لا چکی تھی اور بات وہیں کی وہیں رہ گئی۔ میں کافی پی کر باہر نکل گیا۔

اب یہ میرا روز کا معمول تھا میں اُسے کتابیں لاکر دیتا۔ ایک دن ہمت کرکے میں نے ایک پرچہ اس کتاب میں رکھ دیا اور جواب کا بے چینی سے منتظر رہا مگر جواب نہ آیا۔ میں نے ہمت نہ ہاری ہر کتاب میں نامۂ محبت بھیجتا رہا۔ ایک شام عجیب حادثہ ہوگیا۔ شام سے ہی گھٹائیں گھر کے آرہی تھیں۔ ہوائیں تیز تیز چل رہی تھیں۔ ہلکی سی بوندا باندی تھی۔ سورج ڈوب چکا تھا سرمئی اندھیرا پھیل رہا تھا تبھی تیز ہوا کے ساتھ بارش کا زور شروع ہوگیا۔ کمرے کی لائٹ بند ہوگئی اور جیسے گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا گیا۔ میں فوراً سے موم بتی مانگنے اندر چلا گیا۔ دروازے سے چند قدم آگے

بڑھتے ہی میں جیسے پھولوں کے کسی کنج میں کھو گیا۔ عجیب مدہوش کن خوشبو تھی۔ پھر جیسے برقی رو کا جھٹکا مجھے لگا۔ چند ریشمی زلفوں کا آبشار میرے شانوں پر گرتا ہوا محسوس ہوا اور میرا ہاتھ گوشت پوست کے مجسمے سے ٹکرا گیا۔

"کون ___" اندھیرے میں سہمی ہوئی آواز میں پہچان گیا

"میں ہوں ___" میرے منہ سے دبی ہوئی آواز آئی۔ سنسناتے ہوئے سانسوں کی رفتار بڑھ چکی تھی۔ دفعتاً بادل گرج اُٹھا اور وہ مجھ سے بے اختیار لپٹ گئی۔ چند لمحے یونہی گذر گئے پھر اندھیرے میں ماہی ہتی کی آواز آئی۔

"بی بی جی دیکھیں ٹھہریئے میں ٹارچ لا رہی ہوں۔ بڑا اندھیرا ہے" اس آواز پر میں چونک کر ہٹ گیا۔

"لائٹ کب گئی ___؟" دھیمے سروں میں اُس نے پوچھا۔

"بس کچھ ہی دیر پہلے۔ لیکن اس اندھیرے میں آپ کا وجود کسی نور سے کم نہیں" بے اختیار میں نے کہا۔

"شب میں تلاشِ سحر ___؟ یہ کیسے ممکن ہے" اُس کا جواب آیا۔

"دل کو جلا کر ہم سحر کو پائیں گے" میں نے کہا۔

"اور جو سحر اُجالا نہ دے سکے تب ___؟"

"یاد کو شمع بنا کر نقشِ قدم ڈھونڈیں گے"

"اور جو نقشِ قدم نہ ملے تب ___؟"

"تب تو ہر ذرہ قابلِ پرستش ہے گا۔ کیا پتہ کس جگہ نقشِ پا رکھا ہو"

"اس لاحاصل تلاش کی بنیاد ___؟"

"محبت، پیار، وفا اور پھر قربانی"

"راہ کٹھن ہے منزل دُور ہے۔ تنگیٔ وقت کا رُونا بھی ہے کیسے آگے بڑھا جائے گا؟"

"حوصلہ اور امید پیار کی ناؤ کے پتوار ہیں۔"

"کہیں طوفان گھیر لے پھر ___ ؟"

"پھر تو ___ پھر تو یہی کہیں گے ___

سہل بہت ہے کہ تم دیکھتے ہو ساحل سے
سفینہ ڈوب رہا ہو تو کوئی بات نہیں"

"یہ صرف حوصلہ بامل ہے۔ معصوم سی آواز اُس کے لبوں پہ آئی۔

"آرزو ___" میں نے اندھیرے میں بھی اُس کا ہاتھ تھاما۔

"حقیقت کا سامنا نہ کر پاؤ گے۔"

"جذبہ محبت مجھ میں پنہاں ہے۔"

"لیکن سچائی بڑی تلخ ہے۔ تمہارا حسین تخیل شاید اُس آئینے سے ٹکرا کر چور چور ہو جائے۔"

"حوصلہ سے ہوکر بھی مسکراؤں گا۔"

"بعض لمحات زندگی میں ایسے بھی آتے ہیں جب انسان کو دل سے نہیں دماغ سے کام لینا پڑتا ہے۔"

"ہر صورت میں فیصلہ یہی رہے گا۔"

"جاننا چاہو گے سچائی۔" اُس نے سوال کیا۔

"ہاں۔" میں نے پُر اعتماد لہجے میں کہا۔

"تو پھر میری سالگرہ کا انتظار کرو۔" اُس کا جملہ ختم ہی نہ ہو پایا کہ جانے

آگئی میں سنبھل کر بیٹھ گیا۔ ہنی بھی آ چکی تھی بات آئی گئی ہو گئی اور جب میں اپنے کمرے کو واپس جا رہا تھا تب میں نے روشنی کے ہالوں میں میکدوں سے جام چھلکتے دیکھے۔

آخر کار وہ دن آ ہی گیا جب میرا امتحان تھا میں نے اس کی سالگرہ پر دینے کے لیے ایک بے حد حسین پینٹنگ خریدی تھی۔ ساقی جام و مینا اور رندیلا نوش کا عکس تھا اس کے نیچے چند اشعار تھے۔

پارٹی شروع ہو چکی تھی ڈرائینگ روم مہمانوں سے بھرا جا رہا تھا۔ میں دروازے کے قریب ہی اپنا تحفہ ہاتھوں میں لیے خان صاحب کے بازو کھڑا تھا۔ جانِ محفل کا سب کو انتظار تھا۔ ستارہ رونا کی اس انجمن میں ماہتاب ابھی جلوہ گر نہیں ہوا تھا۔ میرا اضطراب بڑھ رہا تھا جیسے ہی نے مسرا انتظار نا شروع کیا دھیمے سروں میں ٹیپ بج رہا تھا جہدی حسن کی آواز فضا کو گرما رہی تھی۔

بہت خوبصورت ہے میرا صنم

خدا ایسے مکھڑے بناتا ہے کم

اور پھر جیسے شعلہ سا لپک گیا۔ بجلی سی کوندگئی۔ طوفان سا اٹھ گیا۔ گھپ اندھیرے میں ستارہ چمک اٹھا۔ گلاب کی بند کلیاں ایک ساتھ چٹک گئیں۔ وہ آگئی تھی شفق کے رنگ میں ڈوبی ساری پہنے جیسے طلوع سحر اور ڈوبتی شام کا حسن سمٹ کر اس کے پیکر میں ڈھل گیا ہو۔ کاندھوں پر بکھری زلفیں ناگ جو اس کی محافظ تھیں۔ ہونٹوں پہ لالی اور آنکھیں ۔۔۔ بس ۔ شاید قدرت نے بڑے اطمینان سے اسے

بنایا تھا۔ بادام سے اُس کی تراش، نرگس سے نیم خوابی شراب سے مستی، بجلی سے تڑپ، ستاروں سے ضیا، شب سے سیاہی، سحر سے اجالا جیسے زندگی ہی زندگی، میکدہ ہی میکدہ تھیں وہ آنکھیں۔ محفل میں مبارکباد کا شور مچ گیا اور وہ مجھے دیکھے جا رہی تھی۔ میں فاتحانہ انداز میں آگے بڑھا۔ خان صاحب اُس کے قریب پہونچے۔ ٹیبل پہ ایک بڑا سا کیک رکھا تھا۔ خان صاحب نے قریب جا کر اُس کا ایک بازو تھاما۔ ممی دوسرے جانب اُس کا بازو تھامے کھڑی تھی۔ دونوں آگے بڑھے۔ میرے بڑھتے ہوئے قدم ٹھٹھک گئے خان صاحب نے سحر کا ہاتھ پکڑا چھری تھمائی اور کیک کٹوایا۔ تالیاں بج رہی تھیں اور میں سوچ رہا تھا وہ خود سے کیک کیوں نہیں کاٹ سکی۔ اس کا چہرہ مسکرا رہا تھا اور نہ جانے کیوں میرا دل رو رہا تھا۔ سب لوگ تحفے دے رہے تھے میں بھی آگے بڑھا۔

"سالگرہ مبارک ہو۔" میری آواز جیسے صداؤں میں گم ہو رہی تھی۔

"اوہ آپ —" اُس کا چہرہ کھل اٹھا۔

"میرا ناچیز تحفہ قبول کیجئے گا۔" میں نے پینٹنگ اُس کے حوالے کی۔ وہ ہاتھ میں لئے الٹ پلٹ کرتی رہی۔

"ڈیڈی — یہ کیا ہے —؟" اُس نے جیسے خلاؤں میں پکارا۔

"یہ پینٹنگ ہے بیٹا۔ اس میں ساقی بھی ہے جام بھی ہے مینا بھی ہے اور ایک رند بھی۔ اس کے نیچے لکھا ہے —

تیری مخمور نظر کے یہ انوکھے انداز
جیسے کچھ خواب کسی لمس کے برہم ہو جائیں
جیسے صادقین کے خیالات کو مل جائے شبیہ
جیسے خیام کے اشعار مجسم ہو جائیں

نہ جانے خان صاحب کیوں اس شعر کی ادائیگی کے بعد آبدیدہ ہو گئے۔ میں پتھر کا بُت بنا کھڑا رہا۔ مہمانوں کی تواضع کی جا رہی تھی۔ وہ ممی کا ہاتھ تھامے ہر مہمان کے قریب جاتی اور ان کی خاطر کرتی۔ خان صاحب برآمدے میں کھڑے تھے۔ میں بوجھل قدموں سے چلتا ہوا ان کے قریب پہونچا۔

"انکل سحر کو ـــ" میں اتنا ہی کہہ سکا۔

"ہاں نام اس کا سحر ہے مگر آجائے اس کے نصیب میں نہیں۔ ایک حادثے نے اس کی بینائی۔" اس کے آگے وہ کچھ کہہ نہ سکے ان کی آواز رقت سے بھرپور ہو گئی۔ تبھی دروازے پر کسی چیز کے ٹکرانے کی آواز آئی۔ وہ فوراً پلٹے۔

"میں نے کتنی بار کہا کہ ممی کو خود سے الگ مت کرو۔ دیکھو چوٹ لگ گئی نا۔" خان صاحب سحر کو تھامے کہہ رہے تھے اس کی پیشانی پر چھوٹا سا زخم اُبھر آیا تھا۔

ڈیڈی۔ یہ چوٹیں میرے لئے کوئی نئی نہیں۔ چوٹ کھا کر ہی تو سنبھلتی ہوں میں۔" وہ خان صاحب کے سہارے آگے بڑھتی کہہ رہی تھی۔" ڈیڈی آج آپ کو کیا ہو گیا۔ میری سالگرہ کا تحفہ دینا ہی بھول گئے آپ ـــ!!"

خان صاحب نے ایک سرد آہ بھری۔ ایک اداس نگاہ سحر پہ ڈالی اور کہا "میری سحر بیٹی تجھے لگ جاتی"۔ ایک محبت بھرا پیار انھوں نے اُس کے ماتھے پر نقش کر دیا۔

"ڈیڈی یوں نہ کہئیے" سحر کو زندگی کی نہیں سہارے کی ضرورت ہے کب تک آپ مجھے ٹھوکریں کھاتا دیکھنا پسند کریں گے۔" وہ ان کے گلے لگ کر بلک پڑی ـــ ماحول اداسیوں میں ڈوب گیا۔ میں پتہ نہیں اپنے کمرے میں کب چلا آیا۔ رات بھیگتی رہی اور میں خیالات کی بھنور میں پھنسا رہا۔ آدھی رات گذرنے پر میں نے

محسوس کیا کہ دروازے پر کسی نے دستک دی ہے میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ سحر میرے سامنے کھڑی تھی۔ سفید نائٹ گون میں وہ حور سے کم نہیں لگ رہی تھی۔ ایک تقدس آمیز چمک اس کے چہرے پر تھی۔ مگر اب بھی اس سے ڈر رہا تھا۔

"سچائی کے اس آئینے کو دیکھ کر آپ گھبرا گئے نا! میں جانتی ہوں۔ اتنا کہنے آئی تھی کہ دھوکے حقیقت کا چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتے ہیں۔ روشنی زندگی کا پیغام ہے اور اندھیرا موت کا۔ بھلا کون ہے وہ جو موت کو زندگی پر ترجیح دے۔ مجھے آپ سے شکایت نہیں۔ میں جانتی ہوں آپ کی ماں کو خدمت گزار بہو کی ضرورت ہے آپ کو ایک اچھی بیوی کی۔ آپ کے خاندان کو ایک ماں کی۔ میں ان خوابوں کی تعبیر نہیں بن سکتی۔ ہاں۔ ان میکدوں کی تعریف میں آپ کے لکھے اشعار لکھ لیے تھے۔ سناتی رہی اور میں کبھی جواب نہ دے سکی مجھے وقت کا انتظار تھا۔ اور اب وہ سارے پرچے مجھے دے دو۔" اس نے مجھ سے میرے دل کے ٹکڑے مانگے۔ اس نے انھیں میرے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

"جن میکدوں کو آپ زندگی سمجھتے تھے۔ جن میں آپ کو روشنی ہی روشنی دکھائی دیتی تھی۔ آج انہی اشعار کے نیچے یہ بھی لکھ دیجئے گا کہ یہ میکدے ویران ہیں۔" وہ پھوٹ پڑی۔ میں عالم سکتہ میں کھڑا رہا۔ سناٹے میں اس کی سسکیاں گونجتی رہیں۔ کچھ لمحوں بعد اس نے آنسو خشک کیے اور کہا۔ "ہو سکے تو کل صبح مکان خالی کر دیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ڈیڈی آپ سے کوئی امید وابستہ کر بیٹھیں۔ یا آپ جو شہر سے مجھے چھوڑ کر جاتے ہیں شب کی سیاہی کو کوئی اپنا مقدر نہیں بناتا۔ خدارا میری التجا سن لو۔ میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں، مجھ پر رحم کرو۔ قبل اس کے کہ میں کوئی سنہرا خواب دیکھوں تم میرے افق کی سرحدوں سے پرے چلے جاؤ۔ میں تمہاری یاد کو زندگی کا سرمایہ سمجھ کر

جی لوں گی۔ مگر تمھاری زندگی کو اک کربِ مسلسل نہیں بنا سکتی۔ نہیں بنا سکتی ——— خدا حافظ۔" یہ کہتی ہوئی وہ تیز تیز نکل گئی۔ راستے میں کئی جگہ وہ ٹکرا کر بچتی رہی اور مجھ سے یہ بھی نہ ہو سکا کہ میں اُسے سنبھال لوں۔ میری ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں آبشار بن گئیں اور میرے ذہن کے دریچے کھُلنے لگے۔ میں نے دیکھا اماں کا حسرت بھرا چہرہ، ابا کی خونخوار آوازیں، بڑے بھیّا کی تیز نظریں، بھابی اور بہنوں کے طنزیہ جملے، برادری کی لعن طعن ——— اور پھر وہ حقیقت جو سحر بن کر نمودار ہوئی اور شب بن کر میرے سامنے ڈھیر ہو کر بکھر گئی۔ میں نے اپنا سامان یکجا کر لیا۔ اور موذن کی اذان کے ساتھ ہی گھر چھوڑ کر نکل گیا۔ مکان پر الوداعی نظر ڈالتے ہوئے میری پلکوں کے گوشے بھیگ گئے۔ آنسو کے چند قطرے آنکھ سے ٹپکے اور مٹی میں جذب ہو گئے۔ یہ میری بے چارگی کے تھے یا اُس کی بے بسی پر تھے یا پھر اپنی بزدلی پر ——— میں کچھ سمجھ نہ سکا اور تیز تیز قدموں سے آگے نکل گیا۔ میرے دل نے دھڑک دھڑک کر کہا" تو وہ رستہ ہے جو میکدے سے ہو کر بھی پیاسا رہا۔" میں ویرانوں کی بستی سے نکل کر آبادی کی طرف چل پڑا تھا۔ پتہ نہیں یہ میری شکست تھی یا فتح ...

(غیر مطبوعہ)

بے نیازی حد سے گزری

گھڑیال نے دس بجائے اور وہ ڈوبتے قدموں سے اندر داخل ہوا۔ شیروانی اُتار کر اس نے ہینگر میں لٹکا دی، اور کرسی پہ بیٹھ گیا۔ اس کی نظریں پلنگ کی جانب اٹھیں۔ سرخ جھلملاتے کپڑوں میں سمٹی شرمائی دُلہن گردن جھکائے اپنی حنائی اُنگلیوں سے گھونگھٹ کو تھامے بیٹھی تھی۔ سرخ رنگ کے بلب کی روشنی میں کمرہ آگ کی طرح دہک رہا تھا۔ اُس کے دل میں بھی آگ لگی ہوئی تھی وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ آہستہ قدموں سے چلتا ہُوا وہ پلنگ کے قریب پہنچا۔

"زیبا!" اُس نے کہا۔ سرخ کپڑوں میں لپٹی زیبا اور بھی سمٹ گئی تھی۔ کچھ دیر فضا میں چوڑیوں کی کھنک گونجتی رہی، اور پھر ایک سناٹا چھا گیا۔

"آج تمھاری زندگی کی وہ رات ہے جس کے لئے تم نے جاگ جاگ کر شباب کی راتیں کاٹی ہوں گی۔ حسین سپنوں کے جال بُنے ہوں گے۔ اپنی عمر کی ایک ایک گھڑی تم نے اس ایک رات کی اُمید میں گذار دی ہو گی۔ لیکن اتنے طویل انتظار کے بعد اگر تمھیں وہ سب کچھ نہ ملا جس کی تم تمنائی ہو تو اُس وقت تم کیا کرو گی؟" اُس نے پوچھا۔

زیبا اس غیر متوقع سوال سے چونک گئی۔ اُس نے گھونگھٹ اُلٹ دیا۔ اور اُسے دیکھنے لگی۔ اُس کی آنکھوں میں کچھ شرم، کچھ حیرت، کچھ دُکھ کے ملے جُلے

جذبات رقصاں تھے۔

"زیبا! تمہاری ان حنائی انگلیوں کی سُرخ رنگت اب مجھے تمہاری طرف بُلا نہ سکے گی۔ تمہارا یہ سنگھار میں دیکھ نہ سکوں گا۔ میری آنکھیں بند ہیں زیبا! تمہاری چوڑیوں کی کھنک آج مجھے زندگی کا احساس نہ دلا سکے گی۔ تمہاری آنکھوں کے ساغر میں شاید میں ڈوب نہ سکوں۔ میں تو بہت دنوں پہلے ہی جھیل کی سی نیلی آنکھوں میں ڈوب گیا ہوں۔ لیکن میں تمہارے ارمانوں کی قدر کرتا ہوں۔ تمہارے جذبات و احساسات کو سمجھتا ہوں۔ مگر ... مگر میں مجبور ہوں" وہ ٹھنڈی سانس بھر کر بولا۔ زیبا کی تشنگی اور زیادہ بڑھ گئی تھی۔ وہ پلک جھپکائے بغیر اُسے تکتی رہی۔ وہ کہنے لگا۔

"تم نہیں جانتیں زیبا! میری مرضی کے خلاف یہ شادی ہوئی ہے، حالانکہ میں تو ایک ٹوٹا ہوا مسافر ہوں۔ ایک زندہ لاش! جس کے دوش پر سماج نے تم جیسی معصوم لڑکی کا بوجھ رکھ دیا ہے۔ میری آرزوئیں، تمنائیں سب جل گئیں۔ رخسانہ میری پہلی اور آخری محبت ہے۔ اُس کے پہلے یا اُس کے بعد میرے لئے کچھ نہیں! کائنات کی ساری رنگینیاں اُس کے عارض گلگوں پر نچھاور کر دیتا لیکن وہ...... وہ تو پرائے ہاتھوں بک گئی۔" میں دیکھتا رہا۔ میرے سامنے میری دنیا لٹ گئی" اور میں خاموش تماشائی بنا کھڑا رہا۔ اُف بھی نہ کر سکا کہ کہیں میری آہیں رخسانہ کے تازہ نشیمن کو جلا نہ دیں۔" اُس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ زیبا نے دیکھا اُس کی محبت اُس کی آنکھوں سے چھلکنا چاہتی ہے۔ وہ حجاب کو خاطر میں رکھتے ہوئے بھی اُٹھنے پر مجبور ہو گئی۔ میز پر رکھا ہوا پانی کا گلاس اُس نے اُٹھایا اور اُس کے قریب لے گئی۔

"لیجئے ــــ!" اُس نے اپنا حنائی ہاتھ بڑھایا۔

"نہیں زیبا! اس سے میری تشنگی دور نہ ہو سکے گی۔ میں تو رخسانہ کی یاد میں

اُس تیز سیّال کو پیتا ہوں جسے لوگ شراب کہتے ہیں۔ کیونکہ اُس کے خمار میں دکھ بھُولا جاتا ہے۔" اُس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

"شراب پیمانوں ہی میں نہیں آنکھوں کے جام میں بھی چھلکتی ہے! میں کوشش کروں گی کہ آپ کا یہ غم میری آنکھوں کے بہتے ہوئے آنسوؤں سے دُھل جائے!" زیبا کی مترنم آواز اُبھری۔

"اوہ زیبا! تم کتنی اچھی ہو! تم نے میری باتوں کا بُرا نہیں مانا۔ میرے دکھ کو سمجھ کر مجھے سہارا دیا۔ جبکہ میں تمہارا ہو کر بھی تمہارا نہ ہو سکا۔" اُس کی آواز میں بلا کا درد تھا۔

"آپ نے سب کے سامنے اقرار کر لیا مجھے اپنانے کا، یہی میرے لئے بہت ہے۔ پھولوں کی خوشبو سونگھنے کا حقدار کوئی بھی ہو سکتا ہے، مگر اُسے دیکھنے کا حق تو ہر کسی کو مل سکتا ہے۔" یہ کہتے ہوئے زیبا کی اداس نظریں اُٹھیں اور پھر جھک گئیں۔

"زیبا! تم نے مجھے لاجواب کر دیا۔ مجھ میں نہیں آتا تم کیسی لڑکی ہو! لیکن اتنا یاد رکھو تمہیں میں محبت نہ دے سکا تو کیا ہوا! میں اپنے فرض سے کبھی غافل نہ ہوں گا۔ تمہاری خواہشات کا احترام میرا اولین فرض ہو گا۔ میں اتنا کم ظرف تو نہیں کہ جادۂ حیات پہ ہم قدم بننے والی زندگی کو بھول جاؤں۔" اُس نے زیبا کی ٹھوڑی اوپر اٹھا کر کہا۔

"آپ کی انہی عنایتوں کے سہارے یہ زندگی کی ہر کٹھن منزل سے گزر جاؤں گی آپ کی قسم! آپ کو کبھی مجھ سے شکایت نہ ہو گی۔ آپ کے تصورات میں کبھی مخل نہ ہوں گی۔ آپ کی یادوں کو آپ سے نہ چھینوں گی۔ صرف آپ کی خدمت کرنا چاہتی ہوں۔ وہ مسرت مجھے مل جائے تو زندگی کا ہر عیش اُس پر قربان کر دوں!" زیبا کی زبان سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ ایک عزم رکھتا تھا، ایک زندہ حوصلہ رکھتا تھا۔

"شکریہ زیبا! ہزار بار شکریہ! میں سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ اپنے خوابوں کی اس بھیانک

تعبیر کے بعد بھی تم مجھے اپنا سمجھوگی۔" اُس کی ساری کلفت جیسے دُور ہو گئی۔ اُس نے زیبا کو سینے سے لگا لیا۔ مگر تصوّر میں رخسانہ کا چہرہ تھا۔

"ایک بات کہوں ۔۔۔!" زیبا نے پلیٹ اُس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"ہاں کہو!" وہ روٹی پہ مکھن لگاتے ہوئے بولا۔

"آج پکچر ہاؤس میں بہت اچھی فلم آئی ہے چلیں گے ۔۔۔؟"

زیبا نے پوچھا۔

"کون سی فلم ۔۔۔؟" اُس نے سوال کیا۔

"آگ اور دھواں!" زیبا نے کنکھیوں سے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہوں ۔۔۔ آگ اور دھواں۔ آگ بجھنے کے بعد صرف دھواں ہی تو رہ جاتا ہے نا!

اور وہ میرے دل کے اسکرین پر موجود ہے، دیکھنا چاہتی ہو تو دیکھ لو!" وہ سرد آہ بھر کر بولا۔

"معاف کیجئے گا۔ میری بات سے آپ کو دُکھ پہنچا۔ میں شرمندہ ہوں۔" وہ افسردہ ہو گئی۔

"نہیں زیبا! ایسا نہ کہو۔ تمھارا جی چاہا تو ضرور دیکھ لیں گے۔" وہ ناشتے کی میز سے اُٹھ گیا۔

شام کے چھ بجے زیبا کپڑے تبدیل کر کے باہر نکلی۔ وہ ایزی چیئر پر سگریٹ پھونکتا بیٹھا تھا۔ اُس نے مُڑ کر دیکھا۔ "تم ۔۔۔؟" وہ زیبا کو دیکھ کر اُٹھ کھڑا ہوا۔

"کیا ہوا ۔۔۔؟" اُس نے حیرانی سے پوچھا۔

"تم نے یہ نیلا لباس کیوں پہنا؟ تم نے کہا تھا کہ تم میرے جذبات کا احترام کرو گی۔ پھر کیوں مجھے جلا رہی ہو؟ کیوں پہنا تم نے نیلے رنگ کا لباس؟"

وہ ہانپتے ہوئے بولا۔

"م م ..... مجھے نہیں معلوم تھا کہ آپ کو اس رنگ سے نفرت ہے۔" وہ سہم کر بولی۔

"تھیں نفرت نہیں پیار ہے! اس رنگ کو دیکھ کر رخسانہ کی نیلی آنکھیں یاد آتی ہیں۔ سفید آسمان، نیلی جھیل، نیلا لباس ..." وہ کرسی پہ گر پڑا۔ زیبا اُس کے قریب پہنچی۔ وہ بے ہوش تھا اُس کی زبان سے بے ربط جملے نکل رہے تھے۔

"رخشی! میری جان! دیکھو تو یہ نیلگوں آسمان تمھیں دیکھ جھک جھک کر سلام کر رہا ہے۔ نیل کی سی آنکھوں والی میری زندگی! اسی نیلی جھیل کو دیکھ کر کتنی شرمندہ ہو رہی ہے تمھیں دیکھ کر۔ میرے قریب آؤ۔ میری حسرتیں بے چین ہیں۔ میری روح بے قرار ہے۔" زیبا کی موٹی موٹی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ اسی لمحے اُس کی ماں نے اُس کے کاندھے پہ ہاتھ رکھا

"بہو! اس بدنصیب کو صرف تم ہی سنبھال سکتی ہو، میں تم سے شرمندہ ہوں۔ مجھے معاف کر دو۔ کیا کروں بیٹی! ماں جو ٹھہری اس کا دُکھ مجھ سے دیکھا نہیں گیا۔ رخسانہ کی شادی کے بعد سے اس کا یہی حال ہے۔

خاندانی جھگڑوں نے میرے بچّے کو نگل لیا۔ ماں کی مجبوری کو سمجھو بیٹی! وہ اولاد کی خاطر سب کچھ کر سکتی ہے۔ اس کے دل سے رخسانہ کی یاد کو تم نے بھلا دیا تو میں ساری زندگی تمھاری احسان مند رہوں گی! میرے بیٹے کی زندگی سنوار دو۔ میں تمھارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں! اُس کی ماں کا لہجہ کربناک ہو گیا۔ وہ زیبا کے آگے جھک گئیں۔

"امّی جان! خدا کے لئے مجھے گنہگار نہ بنائیے۔ آپ تو وہ مقدس ہستی ہیں جس کے تقدّس کو کائنات مانتی ہے۔ آپ کے قدم جہاں ہوں گے وہ جگہ تو میرے چومنے کے لئے ہے۔ مجھے یوں شرمندہ نہ کیجئے۔ میں آپ سے وعدہ کرتی ہوں، انھیں پھر زندگی کی طرف لوٹا دوں گی اور اگر ایسا نہ کر سکی تو اپنی صورت نہ دکھاؤں گی!" وہ سسک پڑی۔

"میری بچّی!" اُس کی ماں نے اُسے گلے لگا لیا۔ فضا میں دیر تک سسکیاں ڈوبتی اُبھرتی رہیں۔

"زیبا! آج ہماری شادی کو ایک سال ہو رہا ہے!" اُس نے کہا۔
"شاید اسی طرح کئی سال بیت جائیں اور مجھے احساس بھی نہ ہو!"
زیبا بستر کی شکنیں درست کرتے ہوئے بولی۔
"تم نے میرے گال پر طمانچہ مار دیا زیبا!" وہ اداس ہو کر بولا۔
"ارے! آپ بھی کیا کیا سوچ لیتے ہیں! زندگی اتنی خوشی سے گزر رہی ہے کہ وقت کٹنے کا احساس ہی نہیں ہوتا۔ میں تو اپنی مسرت کا اظہار کر رہی تھی!" زیبا نے بات کا رُخ بدل دیا۔ حالانکہ یہ جملہ ادا کرتے ہوئے دل کے کسی گوشے سے کراہنے کی آواز بھی آ رہی تھی۔
"آج شادی کی سالگرہ پر میں تمہیں کچھ دینا چاہتا ہوں قبول کرو گی؟" اُس نے کہا۔
"آپ زہر بھی دیں تو سر آنکھوں پر! لائیے کیا چیز ہے وہ؟" اُس نے ہاتھ بڑھایا۔
"نہیں! اِسے میں خود پہناؤں گا!" اُس نے کہا۔
"آپ کی باہوں سے زیادہ کون سا قیمتی ہار ہوگا! بس ایک بار میرے گلے کے گرد اپنے ہاتھوں کا ہالہ پہنا دیجیے! یقین مانیے دُنیا کے بیش قیمت ہار اُس ہار کے آگے ماند ہو گئے!" زیبا کے لہجے کی شوخی میں پوشیدہ کچھ حزن بھی تھا۔
"زیبا! تم اتنے حوصلے کہاں سے لاتی ہو؟ اس ایک سال کی طویل مدت میں کبھی میں نے تمہیں جی بھر کر دیکھا تک نہیں۔ کاش میں تم سے وفا کر سکتا!" اُس نے کہا ہے

"تیری وفا سے کیا ہو تلافی کہ دہر میں
تیرے سوا بھی ہم پہ بہت سے ستم ہوئے"

زیبا نے عجیب نظروں سے اُسے دیکھتے ہوئے یہ شعر پڑھا

"تم سچ کہتی ہو زیبا! صرف میں نے ہی تم پر ستم نہیں کیا، میری ماں نے کیا، سماج نے کیا، تمھارے سرپرستوں نے کیا۔" وہ بولا۔

"میں کسی کو الزام نہیں دے سکتی۔ آپ تو خواہ مخواہ اُلجھ جاتے ہیں۔ میں تو اپنے آپ کو خوش نصیب سمجھتی ہوں کہ آپ جیسا رفیقِ حیات مجھے ملا جو میری خوشی کو اپنا فرض سمجھتا ہے۔" زیبا کے جملے پھر ایک بار اُس کے دل میں پیوست ہو گئے۔

"ہاں زیبا! صرف فرض سمجھتا ہوں۔ چاہت کے بدلے چاہت تو نہیں دیتا تمھیں!" اُس نے کہا۔

"یہ اپنا اپنا مقدر ہے۔ محفل میں جلتے ہوئے چراغوں کو دیکھو کسی کی لَو بہت دھیمی ہوتی ہے، کسی کی تیز۔ میں شکوہ نہیں کرتی آپ سے گلہ نہیں مجھے۔ ہاں خفا ضرور ہوں۔" وہ خفگی کی اداکاری کرتے ہوئے بولی۔

"کیوں۔ کیا بات ہے؟" اُس نے پوچھا۔

"میں چاہتی ہوں آپ کے اتنا قریب رہوں کہ خود مجھے اپنی خبر نہ رہے! میں تو خود کو زیبا نہیں سمجھتی، آپ کے دل کی وہ تصویر سمجھتی ہوں جسے آپ رخسانہ کا نام دیتے ہیں۔ لیکن آپ ہیں کہ زیبا، زیبا کہہ کر مجھے اپنے وجود کا احساس دلاتے ہیں آج ایک سال بعد میں آپ سے کچھ مانگتی ہوں، میرے دامن میں ڈال دیجیے نا!" وہ ساڑی کا آنچل پھیلا کر بولی۔

"تم..... تم کتنی عجیب ہو! کوئی تمھیں زہر دے رہا ہے، تمھارے وجود کو مسل رہا ہے، تمھاری آرزوؤں کا خون کر رہا ہے۔ مگر تم ایسے قاتل کو پیار کی سوغات دیتی ہو! دیوتا سمجھتی ہو!" اُس نے زیبا کے ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لئے۔

"ہاں میرے دیوتا! آپ مجھے رخسانہ کہہ کر پکار لیں تو میری پرستش کا صلہ

مجھے مل جائے گا! آپ کو یہ نہیں معلوم کہ محبوب کو جو چیز پسند ہو اُسے اپنی پسند سمجھنا محبت کا پہلا اصول ہے!" زیبا نے کہا۔

"رخسانہ! میری رخشی!" اُس نے زیبا کو گلے لگا لیا۔

"اس نام سے مخاطب کرنے کی قیمت بھی چکا دوں آپ کو!" زیبا نے اُس کا ہاتھ اپنے چہرے کے آگے رکھا۔ اُس کی موٹی موٹی آنکھوں سے آنسوؤں کے کئی موتی اُس کے ہاتھوں پر آ گرے۔

"کہیں ایسا نہ ہو کہ اِن آنسوؤں کے سیلاب میں ڈوب جاؤں!" اُس نے کہا۔

"رخسانہ کی یاد کا پتوار اِن آنسوؤں کے سیلاب سے بھی آپ کو بچا لے گا۔ میرے آنسو آپ کو ڈبونے کے لئے نہیں، یہ آپ کے دل کے اُس زنگ کو دھو رہے ہیں جس کی وجہ سے آپ مجھے ایک الگ ہستی سمجھتے ہیں، اپنی رخسانہ نہیں!" زیبا کے لہجے کی اداسی نے ماحول کو بھی اُداس بنا دیا۔

میری جان! تم نے مجھے زندگی بخش دی! تم ساتھ نہ دیتیں تو ایک قدم بھی شاید نہ اُٹھا سکتا۔ تم میری محسن ہو۔ مگر میں بہت گرا ہوا انسان ہوں، تمہیں کچھ نہ دے سکا کچھ نہیں ۔۔۔" اُس کی آنکھیں بھر آئیں۔

"خدا کے لئے اِن پیالوں کو چھلکنے نہ دیجئے۔ میرا دامن اس قابل نہیں کہ اُس مقدس پانی کو جو محبت کے چشمے سے جاری ہوا ہے جذب کر سکے۔" زیبا نے اپنی اُنگلیاں اُس کی آنکھوں پر رکھ دیں۔

"زیبا! آج میں عورت کو دیکھ رہا ہوں! اُس کا سچا روپ مجھے دکھائی دے رہا ہے!" اُس نے آنکھیں بند کر لیں۔

سورج کی پہلی کرن اُس کے چہرے پر پڑی۔ وہ انگڑائی لے کر اُٹھ بیٹھا۔ اُس کی نظر کیلنڈر پر جم گئی جس پر موٹے موٹے حرفوں میں لکھا تھا۔ جنوری ۱۹۷ء۔

"اُف! چار سال گزر گئے ہماری شادی ہوئے! مگر میں آج بھی خود کو اکیلا سمجھتا رہا! زیبا! دیکھو ہماری شادی کو چار سال ہو گئے۔ مگر میں وہی اندھا بھکاری ہوں، جو بار بار ایک ہی دَر پر صدائیں دیتا ہے اور خالی دامن لئے چلا جاتا ہے۔ ٹھیک کہا نا میں نے!" اُس نے مڑ کر دیکھا۔ مگر وہاں زیبا نہ تھی۔

"زیبا! کہاں ہو تم ـــ؟" اُس نے آواز دی۔ کوئی جواب نہ آیا۔ وہ لحاف ہٹا کر اُٹھ بیٹھا۔

"زیبا ـــ!" اُس نے پھر پکارا۔ لیکن کوئی جواب نہ ملا۔

"ماں! تم نے زیبا کو دیکھا ـــ؟" وہ کمرے سے باہر آ کر پوچھ رہا تھا۔

"نہیں تو۔ وہ مجھے صبح سویرے سے ہی سے نظر نہیں آئی" اُس کی ماں نے کہا۔

"تو پھر وہ کہاں گئی۔؟" اُس کے ذہن میں اندیشوں نے سر اُبھارا۔ وہ اپنے کمرے میں واپس چلا آیا۔ ٹیبل لیمپ کے پاس نیلے رنگ کا لفافہ رکھا تھا۔ اُس نے لفافہ اُٹھا لیا۔ اُس پر لکھا تھا ـــ

"اُن کے نام جو محبت کو رُسوا کرتے ہیں

زیبا"

اُس نے جلدی سے لفافہ چاک کیا اور اُس کی نظریں تحریر کو چومنے لگیں۔ وہ خط پڑھنے لگا۔ لکھا تھا ـــ

"پتھر کے دیوتا!

آخری سلام قبول ہو!

چھوڑ دیں ساری دنیا کسی کے لئے یہ مناسب نہیں آدمی کے لئے
پیار سے بھی ضروری کئی کام ہیں پیار سب کچھ نہیں زندگی کے لئے

لتا کے اس درد انگیز نغمے سے میرا رُواں رُواں کانپنے لگا۔ میں نے قلم سنبھالا اور آپ کو مخاطب کرنے پہ مجبور ہو گئی۔ سنو! آج ہماری شادی کو پورے چار سال ہو گئے ہیں مگر یہ چار برس کیسے گذرے ہیں؟ یہ بتانے لگوں تو دل کا صفحہ کافی ہو سکے گا نہ آنسوؤں کی سیاہی، نہ پلکوں کا قلم! بہر کیف ع

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

میرے سرتاج! آپ نے رخسانہ کو دل کی گہرائیوں سے چاہا، پوجا، رات دن اُس کے نام کی مالا جپتے رہے۔ اُس کی محبت کے آگے اپنی بیوی کو بھلا دیا۔ زمانے سے بغاوت کی، خود سے روٹھ گئے، اصولوں کو کچل دیا۔ سماج سے بگڑ گئے، یہ سب کچھ سہی مگر کیا اسی کو محبت کہتے ہیں۔ میں آج آپ سے ایک سوال کرنا چاہتی ہوں ــــ!

"کیا آپ نے واقعی محبت کی ہے؟ اگر کی ہے تو وہ کون سے اصول ہیں محبت کے جن کی رُو سے آپ نے اپنے محبوب کو رُسوا کیا۔ محبت کی تذلیل کی؟

نہیں ــ آپ نے محبت نہیں کی۔ حُسن کو پوجا، اپنے جذبات کے سطحی پن کا اظہار کیا۔ آپ کو یہ بتانا مقصود تھا کہ محبت ہوش و حواس پہ قابض ہو جاتی ہے۔ اپنے بڑے کی تمیز مٹا دیتی ہے، اصول شکنی سکھاتی ہے، بڑوں سے گستاخی، چھوٹوں سے نا اتفاقی کا درس دیتی ہے۔ میرے مالک! خدارا آج میری ہر بات برداشت کر لیجئے، سُن لیجئے۔ میں جانتی ہوں، میں آپ کی شان میں گستاخی کر رہی ہوں۔ مگر گھٹا ٹوپ جب چھا گئی ہیں تو انھیں کُھل کر برس جانے دو۔

"آپ نے محبت کرنا سیکھا، محبت کو سمجھا نہیں۔ اس جذبے کی بلندی سے آپ

واقف نہیں۔ حالانکہ یہ جذبہ کائنات کی رُوح میں اُس وقت سے سمایا ہوا ہے جب یہ دنیا وجود میں آئی۔

"محبت تو عبادت ہوتی ہے میرے ساتھی! اور اُس میں ڈوب جانا زندگی ہے آنسوؤں کا ہر قطرہ تسبیح کے دانے کی اہمیت رکھتا ہے جس سے عاشق اپنے محبوب کے نام کا ورد کرتا ہے محبت کا پہلا اصُول ضبطِ نفس ہے۔ جہاں نفس سرکش ہوا وہاں محبت کی پاکیزگی بغاوت کے گندے پانی سے ناپاک ہو گئی اور جہاں اُس میں استقلال اور صبر آیا سمجھو کہ یہ پاکیزگی نور کی طرح دل کو منور کر دیتی ہے۔ محبت رُسوائی کی طرف نہیں لے جاتی" محبت کا راستہ ایثار اور قربانیوں کی وادیوں سے ہوتا ہوا محبوب کی ذات میں ضم ہو جاتا ہے محبت کی گود ہمیشہ خالی رہتی ہے۔ یہ تجارت تو نہیں کہ نفع کی آس میں زندگی داؤ پر لگا دی جائے۔ بے مروت دوست! اپنی محبت کے ننھے سے پودے کو میں نے آپ کے دل میں لگانا چاہا مگر آپ نے اُسے بے وفائی کے کیڑوں سے پنپنے نہ دیا۔ میں چار سال سے آپ کو دیکھتی آ رہی ہوں۔ آپ بالکل نہ بدل سکے۔ کاش آپ جان سکتے کہ محبت میں معراج کی منزل تک پہنچنے کے بعد کائنات کے ذرّے ذرّے میں محبوب کا جلوہ نظر آتا ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ کون سا جذبہ تھا جس نے منصور سے انا الحق کہلوا کر دار پر چڑھا دیا۔ گوتم کو راج پاٹ تیاگ کر بے گھر کر دیا۔ کاش آپ جان سکتے!

"میں نے سوچا تھا آپ کو محبت کا رُخ بدلنے پر مجبور کر دوں گی" اپنی خاموش فریاد سے، اپنی اداس آنکھوں سے۔ مگر ایسا نہ ہو سکا۔ میری ریاضت رائیگاں گئی۔ میں مجبور ہو گئی ہوں۔ اس لئے آج اس گھر سے رُخصت ہو رہی ہوں۔ ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا۔ ہاں چلتے چلتے اپنی زندگی کا اہم راز آپ پر منکشف کر دوں۔

میں نے بھی محبت کی ہے کسی کو چاہا ہے کسی کو پوجا ہے!

مگر آپ کی طرح محبت کے نام پہ دوسروں کی زندگی نہیں چھینی۔ بلکہ خود کو وقت کے سانچوں میں ڈھال کر زندگی کی آخری سانس تک محبت کو رسوا نہ ہونے دیا۔ لیکن آج مجبور ہو کر آپ سے کہہ رہی ہوں۔ ظفر! میرے پھوپھی زاد بھائی ہیں۔ میں نے اُن کی پرستش کی۔ اُنھوں نے مجھے پُوجا! مگر محبت اتنی ارزاں چیز نہیں کہ اُسے حاصل کیا جائے وہ تو ایثار مانگتی ہے۔ قربانی چاہتی ہے۔ نظروں کے تصادم سے محبت پلتی رہی مگر زبان سے اُس کا اظہار ہو نہ سکا۔ کسی نے سچ ہی کہا ہے، دل کی زبان آنکھیں ہیں۔ میری سوتیلی ماں نے، میرے اقربا نے، میرے سماج نے، میری تقدیر نے مجھے مجبور کر دیا۔ میں آپ سے بیاہ دی گئی۔ اُس رات میں نے قسم کھائی تھی کہ ظفر سے میرا واسطہ چمن کی اُس ہوا کا سا ہو گا جو صرف محسوس کی جا سکتی ہے جس سے دل کو فرحت میسّر آتی ہے۔ میں آپ کو اپنا مجازی خُدا مان کر پرستش کی آخری حد تک پہنچ چکی۔ مگر پتھر کے دیوتا کبھی پگھلتے نہیں۔ ظفر نے حالات سے صُلح کر لی۔ اپنی محبت کو بدنامی کے داغ سے بچانے کے لئے اُنھوں نے شادی کی اور آج دو بچوں کے ساتھ زندگی کی مسرتیں اپنے دامن میں سمائے ہیں۔ لیکن میں بدنصیب ایسی رہی کہ نہ خُدا ہی مِلا نہ وصالِ صنم!

"آپ کو نیلا رنگ پسند ہے نا! اِس لئے میں نے اپنے جسم کو بھی نیلا بنانے کی کوشش کی ہے۔ اب تو آپ مجھے جی بھر کے دیکھیں گے نا! دیکھو ضرور آنا کہیں ایسا نہ ہو کہ مجھے یہ کہنا پڑے ؎

مری نمازِ جنازہ پڑھائی غیروں نے
مرے تھے جن کے لئے وہ رہے وضو کرتے

خاکِ پا
زیبا

"ماں ۔۔۔۔ !!" خط ختم کر کے وہ چیخ اٹھا۔

"ماں! میں آج زیبا کو لانے جا رہا ہوں۔ وہ مجھے چھوڑ کر نہیں جا سکتی! کبھی نہیں" وہ بے تحاشا گھر سے نکل پڑا۔ اُس کے قدم زیبا کے گھر کی طرف دوڑ رہے تھے۔ اُس نے گھر میں قدم رکھا، آہ و بکا کا طوفان اُس کا استقبال کر رہا تھا۔ زیبا ہمیشہ کے لئے ابدی نیند سو رہی تھی۔ اُس کا جسم نیلا تھا۔ اُس کے چہرے پر مسکراہٹ رقصاں تھی جیسے وہ خود کو ہار کر کسی کو جیت چکی تھی۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ اُس نے دیکھا سب سے پہلے ایک نوجوان جس کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا، آگے بڑھا۔ اُس نے زیبا کے چہرے کو کفن سے ڈھانک دیا۔ اُس کی آنکھ سے آنسو ٹپکا کپڑے میں جذب ہو گیا۔ اُس نے زیبا کے جنازے کو کاندھا دیا۔ اور جنازہ گھر سے باہر نکل گیا۔ وہ نوجوان ظفر تھا!

اُس نے سوچا کیا محبت اسی کو کہتے ہیں!
کیا ضبطِ نفس یہی ہے ۔۔۔۔؟
کیا معراجِ محبت اسی کا نام ہے!!

بیسویں صدی، جنوری ۱۹۷۱ء

بہاردے کے خریدے گئے ہیں ویرانے

"آپی! مجھے قمیص چاہیئے....

آپی! مجھے کتابیں چاہیئے....

آپی! مجھے گھڑی لادو نا....

آپی! مجھے پل یا ٹم سلا دو نا....

پے دَر پے یہ تمام جملے اُس کے دل پر دستک دیتے رہے، مگر جانے کیوں دل کا در کھلا ہی نہیں۔ آج وہ چپ ہو گئی۔ اُس نے ان سوالوں کا جواب نہیں دیا۔ بہ مشکل تمام اُس نے اُچٹتی نظر گھر کے دَر و دیوار پر ڈالی۔ دیواروں کا چونا جا بجا اکھڑا ہوا تھا۔ بعض جگہ اینٹیں نظر آرہی تھیں جیسے کچے زخم کو کسی نے کھرچ دیا ہو۔ دالان میں رکھی کرسی کے چاروں پیر ٹوٹ چکے تھے۔ اُس نے اپنے اطراف نظر دوڑائی۔ یوں لگا جیسے وہ بالکل اکیلی ہو۔ اُس کے بھی پیر ٹوٹ چکے ہوں۔ نیما، شیما، عمران، کامران، اُس نے سبھی کو پکارا، لیکن ہر آواز دیوار سے ٹکرا کر واپس آتی رہی۔ پھر اچانک اُس کی نظریں ایزی چیئر کی طرف اُٹھیں۔

بابا! اُس نے آواز دی۔ جواب کے بدلے اُسے کرسی سے پانی ٹپکتا نظر آیا۔ وہ

دوڑ کر کرسی کے قریب پہونچی۔ ہاتھ پھیر کر دیکھا، پانی کا دُور دُور تک پتہ نہیں تھا سوکھی تھی۔ پھر یہ پانی ۔۔۔!؟ ٹپ..... اُس کا ہاتھ گیلا ہوگیا۔ اُس نے چھوٹ کی طرف دیکھا۔ شاید بارش کا کوئی قطرہ ٹوٹی ہوئی چھت سے ٹپک پڑا ہو۔ مگر سورج کی تیز کرنوں کا گزر تھا۔ پھر یہ پانی ۔۔۔؟ وہ سوچ میں پڑ گئی۔ اُس نے آنکھیں بھر پور زندگی اب بہنے لگی تھی۔ گالوں کے راستے سے ہوتا ہوا یہ پانی گردن کو سیرا آہوں، نالوں اور سسکیوں کے درمیان وہ گھر گئی۔ آنسوؤں کے طوفان میں اُسے یاد آگئے، وہ ایک ایک کر کے انہیں دیکھنے لگی.....

"مونا" بیٹی شام کو جلد لوٹ آنا۔ میں نے ڈرائیور سے کہہ دیا ہے، وہ تمھیں گویا اُس کے بابا کہہ رہے تھے یہ وہ وقت تھا جب وہ ریسرچ لیبارٹری کے ڈائریکٹر دولت کی فراوانی تھی عیش و آرام نوکر چاکر سبھی کچھ تھے۔ وہ اپنے دو بھائیوں اور دو کے ہمراہ باغِ زندگی کی گلگشت کر رہی تھی۔ کتنے رنگین دن تھے وہ بھی۔ جب نیا مشیتا اس بازو ہوتے اور عمران و کامران دوسرے بازو۔ وہ کھیلتے اور مونا ان کی ریفری بنتی۔ ا بابا کی ہنسی سے گھر گونج اٹھتا۔

"ان بچوں کو ہم سے زیادہ مونا چاہیئے۔ اس کے بابا کہتے۔

"مونا وہ درخت ہے جو ان چاروں کو اپنی چھاؤں میں لئے رہتا ہے۔" اُس کی امی پھر اچانک گیرج کا پلاسٹر گر گیا۔ وہ نیا مشیتا، عمران، کامران کے ساتھ اُس کے مٹی کو یکجا کیا۔ اس کی شکل قبر جیسی بن گئی۔ امی کی چوڑیاں ٹوٹیں۔ گھر دالان ویران ہوگئی۔ نیا، عمران، کامران امی کو روتے دیکھ کر منہ بسورتے رہے جب اسے کسی نے سمجھایا کہ اُس کے ہارٹ فیل ہوگیا تو وہ رو نہ سکی۔ اندر ہی اندر گھٹ کر رہ گئی۔ غم کی جڑیں اس کی رگ و پے بڑھتی رہیں۔ کچی مٹی کی دیوار پر اگر کوئی نشان لگا یا جائے دیوار کتنی ہی پرانی کیوں نہ ہو جائے

نشان ویسے ہی قائم رہ جاتا ہے۔ جہلم کے بعد کتنے قرض داراموں کے گھر آنے لگے۔ کتنے ساہوکار چکر کاٹنے لگے۔ وقت جھٹکے سے گذرتا رہا۔ مفلسی نے پاؤں گھر میں داخل ہو گئی۔ امی کا سارا زیور سپرتے منکے کی طرح ایک ایک کرکے ختم ہوتا رہا۔ وہ انٹر کر رہی تھی۔ نیا اور شیما ساتویں میں آ گئیں۔ عمران پانچویں درجہ میں مسلسل فیل ہو رہا تھا۔ کامران دن بھر گلی کے آوارہ بچوں کے ساتھ گھومتا رہتا تھا۔

"امی گھر کی یہ حالت مجھ سے دیکھی نہیں جاتی۔ میں کہیں نوکری کر لوں گی۔ نیا اور شیما سمجھدار ہو رہی ہیں۔ ان کا شعور اگر ابھی سے احساس غم اور دردِ محرومی لے کر بیدار ہو جاتا ہے تو وہ آگے بڑھ نہ سکیں گی۔ میں نے ہوش سنبھالنے کے بعد سے جو کچھ بھی دیکھا اُسے سہہ لیا۔ میں نہیں چاہتی کہ ان ننھے ذہنوں پہ کانٹوں کی باڑ لگا دی جائے۔ مجھ پہ اعتماد رکھیے کوئی کام ایسا نہ کروں گی جس سے آپ کا سر نیچے ہو"

اور پھر مونا قوتِ ارادی کا جامہ پہن کر ارمانوں کو مقفل کرکے میدانِ عمل میں آ گئی۔ ایک ماہ بعد وہ اپنی پہلی کمائی لیکر امی کے پاس پہونچی۔ امی کے آنسو تسبیح کے دانوں کی طرح ٹوٹ گئے۔ تیل کی چند بوندیں جس چراغ میں پڑی ہوں وہ رفتہ رفتہ بجھ جاتا ہے کسی کو خبر بھی نہیں ہونے پاتی کہ یہ چراغ کب گل ہوا۔ اُس کی ماں بھی ایک صبح ایسے ہی سو گئیں۔ دل پر آرے سے چل گئے۔ معصوم بچپن تڑپ اُٹھا۔

"آپی ـــ اب کیا ہوگا ـــ؟" نیما، شیما سہم گئیں۔

"کچھ نہیں میں جب تک زندہ ہوں تمھیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں" بیس برس کی عمر میں مونا کو ساٹھ برس کا تجربہ آ گیا۔ وہ پبلک گارڈن میں نیما، شیما کو لے کر گھومنے آئی تھی۔ مخملی سبز گھانس پہ ٹہلتی رہی۔ کتنا سکون مل رہا تھا اُسے۔ تاحدِ نظر سبزہ ہی سبزہ تھا۔ نرم نرم گھانس کتنی راحت بخش ہوتی ہے۔ ٹہلتے ٹہلتے وہ دُور تک

نکل گئی۔ دفعتاً پھولوں کی کنج سے وہ باہر آیا۔

"کتنے دن بعد دیدار ہوا تمھارا۔ موُنا مری زندگی"۔ اُس نے موُنا کی اُنگلیاں آنکھوں پر رکھ لیں۔

"ضیا! جذباتی نہ بنو ان اُنگلیوں میں پھولوں کی نرمی نہیں، کانٹوں کی چبھن ملے گی تمھیں۔"

وہ سبز آنچل کو سمیٹتی ہوئی بولی۔

"میں ان کانٹوں کی سیج پر لیٹ جاؤں گا۔

"لہولہان ہو جاؤ گے ضیا!

"یہی میرے لئے معراجِ محبت ہوگی موُنا"۔

"لیکن کسی کے لئے باعثِ رُسوائی بھی ہوسکتی ہے"۔

"زبان کو تالے نہ لگاؤ موُنا"۔

"تو پھر میں خوُد کو محصور کرلوں گی۔"

"میں ہر حصار توڑ دوں گا"۔

"خُدا کے لئے بھول جاؤ مجھے"۔

"خوُد کو بھوُل سکتا ہوُں"۔

"ضد نہ کرو"۔

"پیار کو ضد نہ سمجھو"۔

"تم انتظار نہ کرسکو گے"۔

"صرف انتظار میں جی لوُں گا موُنا"۔

"لیکن ذمّہ داریوں کے ختم ہونے تک ہم اس دوَر سے گذر جائیں گے۔"

جہاں تمنائیں شباب پہ ہوتی ہیں۔"
"تمھیں پانے کی تمنائیں ساری زندگی شباب پر رہیں گی۔"
"تم میرا ساتھ نہ دے سکو گے۔"
"آزما سکتی ہو۔"
"لیکن میں نہیں چاہتی کہ تمھاری محبّت قید کر لے۔ تمھاری تڑپ مجھے مجبور کر دے۔ تمھارا پیار مجھے جکڑ لے۔ تمھارے آنسو میرا راستہ روک لیں۔ تمھاری چاہت مجھے اپنے فرائض سے دُور کر دے۔ تمھارا لیے مجھے بھول جاؤ ــــ بھُول جاؤ ــــ" یہ کہتی ہوئی وہ نرم گھاس پہ دوڑنے لگی۔ اب یہی نرمی اسے کانٹوں کی طرح کھٹکنے لگی تھی۔
"موُنا ــــ موُنا" ضیار کی آواز اُسے دُور تک سُنائی دی۔
"آپی۔ آپی کہاں رہ گئیں تھیں آپ ــــ؟" نیما اور شیما اس کے قریب آگئیں۔
اُس دن ضیار نے دو ٹکٹیں خریدیں۔
"موُنا پلیز ــــ آج کی شام میرے ساتھ گذار دو"۔
"نہیں ضیار ــــ جو رہنما ہوتے ہیں رہزن کیسے بن جائیں۔
میں دیر سے گھر پہونچوں گی تو ان کے ذہنوں میں ہزاروں خیالات مچلنے لگیں گے۔"
"تم نے ہر بار مجھے ٹھکرایا۔" ضیار اُداس ہو گیا۔
"مجھے سمجھنے کی کوشش کرو۔ جب تم میری مجبوری نہ سمجھ سکتے ہو تو میرا ساتھ دوگے۔ اسی لئے تو کہتی ہوں کہیں اور دل دے دو۔" ضیار ہنس پڑا۔
"خوب مذاق کر لیتی ہو۔ تمھاری مجبوری اور تمھاری ذمہ داری ہی تو وہ زنجیر ہے جو میرے قدموں کو آگے بڑھنے سے روکتی ہے۔ لیکن موُنا جن لمحات کو تم برباد کر رہی ہو اس کا دُکھ تمھیں بعد میں ہوگا۔"

"میں خوشی کے لئے نہیں اوروں کے لئے جی رہی ہوں" تم میرے ہو لیکن مجھے سمجھ نہ سکے ضیا۔"

"نہیں مونا۔ میں سمجھ گیا اچھی طرح جان گیا۔ تم ضیا رکے صبر کو آزما رہی ہو۔ اس کے ضبط کو پرکھ رہی ہو۔ اس کی محبت کا امتحان لے رہی ہو۔ تو سنو میں اب تم سے اسی وقت ملوں گا جب تم ہر ذمہ داری سے سبکدوش ہو کر صرف اپنے آپ کو لئے میرے پاس آؤ گی" اور پھر ضیا ر چلا گیا۔ روشنی سمجھ گئی۔ مونا اندھیروں میں کھو گئی وہ آنسو بھی نہ بہا سکتی تھی کتنی بے کسی تھی۔ ضیا سے مل کر جب وہ واپس گھر آئی تو عمران جا رہا تھا۔

"کہاں چلے عمران ــــ"

"جہاں قسمت لے جائے۔"

"لیکن کیوں ــــ؟"

"آپا۔ آپ کن کن کا بوجھ اٹھاتی رہیں گی۔ میں اب اس قابل ہوں کہ خود کو سنبھال سکوں۔ میں ایئر فورس میں بھرتی ہو چکا ہوں۔ مجھے بھی حالات کا مقابلہ کرنا ہوگا۔"

وہ رو کتی رہی اور عمران چلا گیا۔ دالان میں رکھی کرسی کا ایک پیر ٹوٹ گیا۔ وقت کا پہیہ گھومتا رہا۔ وہ کولہو کے بیل کی طرح اپنے کاموں میں جتی رہی۔ نیا ناشیا ایسے پھول بن گئے جن میں آرزو ؤں کے رنگ ہوتے ہیں۔ اور مونا تو بیلے کا یکرنگی نازک سا پھول تھی جس میں خوشبو ضرور تھی مگر رنگ نہیں۔ ایک طویل عرصہ کے سناٹے کے بعد اس نے پہلی بار گھر میں قہقہے گونجتے سنے۔ وہ تیزی سے اندر کے کمرے کی جانب بڑھی۔

"ارے اکرام بھائی آپ ــــ" مونا نے اپنے خالہ زاد بھائی کو دیکھ کر کہا۔

"جی ہاں! یہ خاکسار وہی پرانا خادم ہے آپ کا۔" اکرام نے جواب دیا۔
"آپ کب آئے۔ اتنے دنوں بعد ہماری یاد کیسے آئی۔ خالہ امی کے گذرنے کے بعد تو آپ ہمیں بھول ہی گئے تھے۔" مونا نے شکایت کی۔
"نہیں مونا ایسی بات نہیں۔ مصروفیت۔ وقت کی تنگی اور دوری سے ہم مل نہیں پائے۔ اچھا یہ بتاؤ زندگی کیسے گذر رہی ہے تمہاری ــ؟" اکرام نے پوچھا
"بس یوں سمجھئے۔ زیست کا طویل سفر ہے۔ کھلا آسمان ہے۔ پھیلی ہوئی زمین ہے۔ نہ کوئی سائبان ہے نہ گھنی چھاؤں۔ راستہ پُرخطر ہے۔ ہر پل خوف ہے آگے پیچھے غموں کا خوفناک اندھیرا ہے۔ یہ سب ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے میرے پیچھے چلے آرہے ہیں۔ میں اُمید وحوصلے کا چراغ جلائے آگے بڑھتی جارہی ہوں۔ گھٹائیں گھر کر آتی ہیں تو میں اپنی زلفوں کا ان پر سایہ کر دیتی ہوں۔ بجلی چمکتی ہے تو اپنی باہوں میں چھپا لیتی ہوں۔ بادل گرجتے ہیں تو سینے سے لگا لیتی ہوں۔ راہ پُرخار ہو جاتی ہے تو پلکوں سے خاروں کو چن لیتی ہوں۔ گرد وغبار چھپنے لگتا ہے تو اپنی سانس کی دیوار بنا کر اسے روک دیتی ہوں۔ میرا فرض، میرا کام، زندگی، میری اُمیدیں، اب یہی سب ہیں۔" مونا نے شیما کے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔
"مونا تم تو فلسفی بن گئی ہو۔"
"وقت پاگل نہ بنا سکا شاید اسی لئے۔"
"اچھا ایک بات کہوں۔ تم نے شادی کیوں نہیں کی ــ؟"
"کیا جینے کے لئے یہ ضروری ہے؟" مونا نے پوچھا۔
"جینے کی بات نہیں یہ ایک سماجی بندھن ہے، مذہبی اصول ہے۔"
اکرام نے جواب دیا۔

"مانتی ہوں۔ لیکن عمر تو ساری پڑی ہے۔"
"عمر تو خیر پڑی ہے مگر تقاضۂ سن بھی تو کوئی چیز ہے" اکرام نے زور دے کر کہا۔

اگر ہر جائز و ناجائز تقاضوں کی تکمیل ہوتی رہے تو جد و جہد زندگی ہی بیکار ہے۔ ایک پہاڑ کی چوٹی تک پہونچنے کے لئے کافی دشوار گذار راستہ سے ہو کر جانا پڑتا ہے۔ اس دوران کبھی ہمت دم توڑ دیتی ہے کبھی تھکن کا احساس پاؤں پکڑ لیتا ہے۔ کبھی تھوڑی دور چل کر ہی راستے کو منزل سمجھ لینے جی چاہتا ہے زندگی جتنی طویل ہے تقاضے بھی اتنے ہی زیادہ ہیں۔ مگر ہر تقاضۂ بشریت اور انسانیت کے تقاضوں کے بعد ہے۔ میں ان ہی تقاضوں کی تکمیل کے لئے جد و جہد کر رہی ہوں" مونا نے جواب دیا۔

"لیکن تمہاری اس ضد سے کسی اور کا نقصان بھی ہو سکتا ہے" اکرام نے دوسرا جملہ کہا۔

"مثلاً — ؟" وہ چونک کر بولی۔

"نیما اور شیما عمر کی اس منزل کو پہونچ گئی ہیں۔ جہاں چاروں طرف رنگین سپنے دکھائی دیتے ہیں وہ اپنی آنکھوں میں ستاروں کی جھلملاہٹ رکھتے ہیں۔ اپنی ہنسی میں پھولوں کا تبسم۔ اپنی رفتار میں بادِ نسیم۔ اپنی گفتار میں نغمۂ بربط، اپنی زلفوں میں گھٹاؤں کا نکھار۔ اپنے لبوں پہ شرابِ دو آتشہ، وہ سر تا پا گلشن ہیں بلبلِ ہزار داستان گیت گاتا ہوا جھرنا۔ اور تم سنگِ مرمر کا ایک گوشہ گیا بت جمیلی کا ایک رنگین پھول سوکھ رہی۔ تمہارے انکار سے ان کا کیا ہوگا۔" اکرام ہار ماننے کے لئے تیار نہ تھا۔

"میں اِن کے گلشنِ زلیست کی نگہبانی کے لئے باغبان کی تلاش میں ہوں۔" مونا نے جواب دیا۔

"اور اپنے ویران چمن کی آراستگی کے لئے تم نے کسی مالی کو نہیں ڈھونڈا۔" اکرام نے ستار کو پھر چھیڑ دیا۔ درد بھرے سُر بج اٹھے۔

"جب میرے خونِ جگر سے سینچے ہوئے پودے کسی اچھے نگہبان کے ہاتھ جائیں گے تو میرا ویرانہ خود بخود آباد ہو جائے گا۔" مونا نے جواب دیا۔

"کیا میں شیما کے لئے خود کو نگہبان سمجھ سکتا ہوں۔" اکرام مطلب پر آ چکا تھا۔

"آپ۔۔۔ آپ تو شادی شدہ ہیں۔" مونا کا منہ کھل گیا۔

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ یہ سمجھ لو کہ میں تم سے ہمدردی کر رہا ہوں۔"

"نہیں چاہیے مجھے یہ بھیک، آپ جا سکتے ہیں۔" مونا گرج کر بولی۔

"سوچ لو۔ میں چلا تو جاؤں گا۔ لیکن تم مجھے پھر بلاؤ گی۔" اکرام چلا گیا۔

"آپی۔ کیوں لوٹا دیا اکرام بھائی کو۔" شیما یکلخت سامنے آکر بولی۔

"شیما۔ تم اندر جاؤ۔ سمجھ نہیں سکو گی کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔"

"میں سب کچھ سمجھتی ہوں۔ میں کوئی دودھ پیتی بچی تو نہیں ہوں۔" شیما نے جواب دیا۔

"شیما۔ یہ تو کہہ رہی ہے۔" مونا نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

"رہنے دیجئے۔۔" اس نے ہاتھ جھٹک دیا۔ "بڑی محبت کرتی ہیں نا آپ ہم سے تبھی تو اکرام بھائی کو گھر سے چلا دیا۔ ایک خوشی ہم نے تمہارے گھر دی تھی بھی آپ لینے سے انکار کر رہی ہیں اس لئے کہ ہم آپ کے پروردہ ہیں۔ آپ ہمیں پالتی ہیں نا آپ کی کوئی آرزو، کوئی تمنا نہیں۔ لیکن آپ نے یہ کیسے جان لیا کہ ہر لڑکی آپ کی طرح پتھر دل ہوگی۔ ایک خوشی اُن سے مل رہی تھی اور آپ اُسے بھی دیکھ نہ سکیں۔ اس لئے کہ خود آپ کے دل میں اندھیرا

ہے جس کا اپنا گلشن ویران ہو، وہ دوسرے کے چمن کی شادابی کہاں سے دیکھ سکے گا۔"
اک پگھلتا ہوا لاوا کھولتا ہوا تیل مُونا کے رگ و پے میں خون کی طرح دوڑ گیا۔

"شیما رک جاؤ۔ شیما بس کرو۔ تم اکرام کو اپنا سکتی ہو" یہ کہتی ہوئی مُونا چپ ہو گئی ایسے ہی جیسے کوئی مانا ہوا جواری پہلی بار ہار گیا ہو اور واقعی اسے اکرام کو واپس بُلانا پڑا

شیما کا نکاح اکرام سے ہو گیا کُرسی کا دوسرا پیر ٹوٹ چکا تھا وہ پگھلتی شمع کی طرح خاموش رہی۔ جس دن اُسے ترقی ملی وہ اس خبر کو سُنانے کے لئے وقت سے پہلے گھر پہنچ گئی لیکن اُسے وہاں ایک اور دُکھ ملا۔

"آپی۔ کامران گھر سے چلا گیا۔" اُس نے کہا کہ وہ اس دلدل میں سانس نہیں لے سکتا، وہ اپنے دوستوں کے ساتھ بمبئی چلا گیا ہے۔ کہتا تھا کہ اب کبھی واپس نہیں آئے گا۔" نیما نے بتایا۔

وہ دھم سے کرسی پر بیٹھ گئی۔ دالان میں رکھی کُرسی کا تیسرا پیر بھی ٹوٹ گیا۔ اور مُونا کو لگا جیسے اُس کے بازو بیکار ہو گئے ہیں۔

کمپنی میں منیجر ہوتے کے باوجود مُونا خوش نہ رہ سکی۔ اُسے نیما کی فکر کھائے جا رہی تھی۔ اُس نے تلاش کر کے ایک لڑکا ڈھونڈ لیا تاکہ نیما کے ہاتھ پیلے کر دے۔ جس دن لڑکے والے نیما کو دیکھنے آ رہے تھے۔ وہ آفس سے جلد لوٹ آئی تاکہ نیما کو سنوار سکے۔ اس کے سوا گھر میں اور تھا ہی کون، مگر ...... جیسے ہی وہ اندر آئی گھر میں موت کا سناٹا اسے محسوس ہوا۔ وہ تیزی سے نیما کے کمرے کی طرف بڑھی نیما پلنگ پر پڑی تھی۔

"نیما" یہ وقت سونے کا نہیں اٹھو تیار ہو جاؤ۔ لوگ آنے والے ہیں"
مگر جواب میں دور تک خاموشی تھی۔ اُس نے نیما کا شانہ ہلایا۔ اُس کا چہرہ ایک بازو ڈھلک گیا۔ اور سینے پر رکھا ہاتھ پلنگ سے نیچے جھولنے لگا۔ اُس کے سینے

پھر ایک چھٹی رکھی ہوئی ملی۔ مونا نے اسے کھولا۔

آپی۔ آپ نے جو کچھ بھی ہمارے لئے کیا وہ ایک ماں ہی کر سکتی تھی مگر جواب میں آپ کو کچھ نہ مل سکا۔ عمران چلے گئے۔ شیما نے بغاوت کی، کامران آوارہ ہو گیا اور میں اس لئے جا رہی ہوں کہ آپ کا حق چھیننا میرے لئے گناہِ عظیم ہے۔ میں بزدل ہوں آپ کی طرح حوصلہ نہیں مجھ میں۔ آپ میری شادی کے لئے کوشاں ہیں مگر۔۔۔ میں نے بھی کسی کی پوجا کی ہے، کسی کو چاہا ہے لیکن یہ میری کم نصیبی کہ مجھے محرومی ملی۔ ایک راز کا انکشاف کر دوں تو مجھے بُرا نہ سمجھئے گا آپی! میں بھی ضیاء سے پیار کرتی ہوں۔ مگر افسوس کہ پیار کے بدلے تغافل ہی میرے نصیب میں رہا۔ انہوں نے ٹھکرا دیا اس لئے کہ وہ آپ سے پیار کرتے ہیں۔ آپی۔ مجھے غلط نہ سمجھنا، میں اپنی شکست پر زخم خوردہ ضرور ہوں لیکن ضیاء کو آپ کے حوالے کرتے ہوئے مجھے مسرت بھی ہے میری اس قربانی کو قبول کیجئے گا۔

آپ کی
"نیما"

"نیما ــــــــــــ نیما" یہ کیا کر دیا پگلی تو نے۔ وہ اس سے لپٹ گئی۔ مانگ کر دیکھتی اپنی آپی سے۔ وہ سب کچھ تجھے مل جاتا لیکن تو نے ــــ تو نے یہ کیا غم دے دیا" مونا کا درد پارے کی طرح بکھر گیا۔ دالان میں رکھی کرسی کا آخری پیر بھی ٹوٹ چکا تھا۔

امی، بابا، نیما، شیما، عمران، کامران، وہ سبھی کو آوازیں دیتی رہی مگر جواب میں ہر طرف خاموشی تھی۔ وہ آنسوؤں کے طوفان میں گھر گئی۔ سب کے چہرے ایک کے بعد ایک اس کے سامنے آ گئے۔ آنسوؤں کے بہتے آبشار سے وہ دیکھتی رہی۔۔۔ بلکتی رہی۔۔۔۔ تڑپتی رہی۔

دن ڈھلا، شام آئی۔ رات گذری اور پھر سفیدیٔ سحر نمودار ہوئی۔ اس نے دیکھا ایک تارہ (مٹما) ٹمٹما رہا تھا۔ یہ صبح کا تارا تھا۔ اسے محسوس ہوا جیسے ڈوبتے کو تنکے کا سہارا مل گیا ہو"

بجھتے چراغ کو تیل کی چند بوندیں، زخم کو مرہم، درد کو دوا، طوفان کو کنارہ، مسافر کو منزل، ویران چمن کو مالی، میکدے کو ساقی، ساغر کو شراب، انگوٹھی کو نگینہ، ہاتھ کو حنا، آنکھ کو کاجل، مانگ کو افشاں اور گلے کو ہار مل گیا ہو۔

اُسے دفعتاً ضیا یاد آ گیا ـــــ وہی ضیا جو اُس کے سپنوں کا مرکز تھا، اُس کے ارمانوں کا منبع، اُس کی آرزوؤں کا تنا ور درخت، اُس کے انتظار کا ثمر تھا۔

اُس کی کار ضیا کے گھر کی طرف مڑ گئی۔ کار سے اُتر کر وہ گیٹ پر پہنچی۔ وہاں ضیا کا نیم پلیٹ لگا تھا۔ اُس نے کال بیل بجائی مگر آواز نہ آئی۔ پڑوس میں دریافت کرنے پر جواب ملا۔
"ضیا صاحب تو دو سال ہوئے امریکہ چلے گئے۔ البتہ اِن کی بیوی اور بچّی شاید کہیں گئے ہیں۔"

اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ بڑی دیر تک وہ گُم سُم کھڑی رہی۔ اس کے بعد ڈوبتے قدموں سے کار میں سوار ہو گئی۔ اسٹیرنگ پر اس کا ہاتھ گھومنے لگا وہ اپنے آپ بڑبڑانے لگی۔

"یہ دُنیا کتنی عجیب ہے، یہاں کوئی کسی کا نہیں۔ سب دعوے باطل ہیں۔ سب وعدے جھوٹے، سب ناطے بکھرے موتی ہیں۔ محبّت و پیار، دھوکہ اور فریب کا دوسرا نام ہے، انتظار، جھوٹی تسلیوں کا آشیانہ، اعتبار، کم فہمی کا میخانہ، وفائیں، ریاکاری کا لباس، آرزوئیں زندگی کا مرثیہ ہیں۔ یہاں کوئی میرا نہیں۔" اور کار کا اسٹیرنگ اس کے ہاتھ سے پھسل پڑا، تیزی سے بڑھتی ہوئی کار ایک جھٹکے کے ساتھ رک گئی۔ اُس نے دیکھا ایک عورت اس کی کار کے آگے بے ہوش پڑی ہے۔ اس کے قریب چھ سالہ ایک پیاری سی بچّی بھی تھی۔ مونا اُسے لے کر ہاسپٹل پہونچی۔

"ڈاکٹر پلیز اسے بچائیے۔" مونا کی پیشانی عرق آلود تھی۔

"میں پوری کوشش کروں گا محترمہ۔ لیکن ہوسکتا ہے انہیں خون کی ضرورت پیش آئے" ڈاکٹر نے کہا۔

"ڈاکٹر اس کی فکر مت کرو"۔ "میرے خون کا آخری قطرہ بھی مجھ سے لے لیں لیکن اسے بچا لو۔"

"ٹھیک ہے لیجیے میرے ساتھ" ڈاکٹر نے کہا اور مونا اٹھ کھڑی ہوئی۔

"میری ممی کب جاگے گی" بچی نے بیقرار ہو کر پوچھا۔

"ابھی جاگ جائے گی بیٹی۔" مونا نے نقاہت کے باوجود اُس کے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"آپ کو کیا ہو گیا آپ کو تو چوٹ نہیں لگی تھی نا! پھر اتنا سارا خون کہاں سے آگیا۔" بچی نے معصومیت سے خون کی بوتل کو دیکھ کر پوچھا۔

مونا کے دل میں چوٹ اُبھر آئی۔

بیٹا۔ کبھی کبھی چوٹ نظر نہیں آتی اور دوسروں خون بہہ جاتا ہے" اور مونا کی آنکھیں خون رونے لگی تھیں۔

"اچھا یہ بتاؤ تم کہاں رہتی ہو؟" مونا نے پوچھا۔

"اپنی ممی کے پاس۔" معصوم سا جواب ملا۔

"میرا نام تو چھنا ہے مگر ڈیڈی مجھے مونا کہا کرتے ہیں۔" اس جملہ پر وہ چونک گئی۔

"مونا۔" اُس نے دہرایا۔

"ہاں ڈیڈی کہتے ہیں مونا سے اچھا کوئی دوسرا نام نہیں۔ مونا کہانیوں والا نام ہے پریوں والا نام ہے گڑیوں کا نام ہے۔" چھنا بولی۔

تمہارے ڈیڈی کا نام کیا ہے؟" مونا نے ڈرتے ڈرتے سوال کیا۔

میرے ڈیڈی کا نام فہیم احمد ہے۔" چھنا کے اس جملے پر مونا کا دل حلق میں آگیا

آ کر رُک گیا۔

"بس.... بس.... وہ درد کی تکلیف سے کراہ گئی۔ انجکشن کی سوئی اس کی حرکت پر کچھ ہٹ گئی تھی۔

"پلیز ڈونٹ اسٹر (PLEASE DONT STIR) نرس نے سوئی برابر کی۔ موُنا نیم غنودگی کی حالت میں تھی اور مریضہ کو ہوش آ رہا تھا۔

"میں کہاں ہُوں — میں... کہاں ہوں" اُس نے ڈوبتے لہجے میں پُوچھا۔

گھبرائیے نہیں۔ اب آپ بالکل اچھی ہیں۔ ان کے بر وقت خون دینے سے آپ بچ گئیں"۔ ڈاکٹر نے کہا۔

"آپ میری کار سے ٹکرا گئی تھیں... موُنا نے اسپرٹ سے زخم صاف کرتے ہوئے کہا۔

"میں آپ کی مشکور ہوں کہ آپ نے خون دے کر مجھے بچا لیا۔" مریضہ نے کہا۔

"شرمندہ نہ کیجئے۔ شکر گذار تو میں ہوں کہ آپ اچھی ہو گئیں۔ چلیئے میں آپ کو آپ کے مکان چھوڑ آؤں۔ موُنا نے کہا۔ کچھ پس و پیش کے بعد وہ لوگ کار میں بیٹھ گئے۔

"معاف کیجئے گا کیا میں آپ کے بارے میں پُوچھ سکتی ہُوں"۔ موُنا نے سوال کیا۔

"میرا نام ہُما ہے۔ میں ضیا آفندی کی بیوی ہوں۔ آج کل وہ ریسرچ کے سلسلے میں اپنے ڈپارٹمنٹ سے امریکہ گئے ہوئے ہیں۔ میں فُل موُن ہوٹل کے روبرو رہتی ہوں۔ آج موُنا کے ساتھ یونہی چہل قدمی کو نکلی تھی کہ...... ہُما نے مختصر سا تعارف کروایا۔

"بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر" موُنا نے کہا

اسی عرصے میں ہُما کا گھر آ چکا تھا۔

"آئیے نا! کچھ دیر ہمارے ہاں بیٹھ کر جائیے۔" ہُما نے اصرار کیا۔ جنا نے ہاتھ تھام لیا۔

"آئیے نا آنٹی ـــــــ" اور وہ انکار نہ کر سکی۔

"میں آپ کو ڈیڈی سے ملواؤنگی وہ میری برتھ ڈے پر آرہے ہیں۔ اب تو آپ صرف اِن کی تصویر دیکھ لیجئے" حِنا نے ایک بڑی سی فوٹو کی طرف اشارہ کیا۔ یہ ضیا ہی کی تصویر تھی۔

یہ تصویر بہت پرانی ہے لیکن مجھے پسند تھی۔ اس لئے میں نے اُن کے پرانے کاغذات میں سے نکال لی" ہما کہہ رہی تھی اور مونا کو یاد آ گیا بالکل ایسی ہی تصویر اس کی الماری میں بھی محفوظ ہے۔

"آپ نے اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا ـــ؟" ہما نے سوال کیا۔

"مم . . . میں ـــ میں تو بس اکیلی ہی اکیلی ہوں۔ حادثات کو یکجا کر لوں تو میرا پیکر ڈھل جائے گا، سچ پوچھئے تو ـــــــــــــــ

میں نے ہر غم خوشی میں ڈھالا ہے
میرا ہر اک چلن نرالا ہے
لوگ جن حادثوں سے مرتے ہیں
مجھکو اُن حادثوں نے پالا ہے

جب سے ہوش سنبھالا غم کو دیکھا ہے۔ غم نصیبوں کے کام آ کر سُکھ ملنے لگا ہے اب مقصدِ حیات خدمتِ خلق ہے۔ پے درپے حادثات نے دل کو اس قدر مضبوط کر دیا کہ اب غم کو میں غم نہیں سمجھتی بلکہ میرے نزدیک ـــ

زندگی کے شکستہ ساغر میں
کیف انگیز چاندنی بھر دی
آگ سمجھے تھے غم کو ہم لیکن
غم نے تو دل میں روشنی کر دی

"مجھے بڑا دکھ ہے کہ میں نے آپ کو کریدا" ہما نے کہا۔
"آنٹی میری برتھ ڈے پر آپ آئیں گی نا!" حنا نے کہا۔

"ہاں، ہاں ضرور" مونا بولی۔
"ضیاء بھی آجائیں گے میں آپ سے انھیں ملاؤں گی وہ مونا کو بہت پیار کرتے ہیں مونا ان کی زندگی ہے، مونا ان کا سب کچھ ہے۔ جانے کیا پسند آگیا یہ نام۔ میں حنا پر زور دیتی رہی اور وہ مونا کے پیچھے لگے رہے۔ اس کی پیدائش پر ہی میسز کمال سے کہہ دیا اس کا نام صرف مونا ہوگا۔ مونا۔ میری مونا میری زندگی، میرا کل متاع حیات اور پھر اس کا نام مونا ہی ہو گیا" ہما کہہ رہی تھی اور مونا خلاؤں میں پرواز کرنے لگی۔
"کیا وہ آج بھی مجھ سے پیار کرتے ہیں" ذہن نے کریدا۔
"اور نہیں تو کیا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ مونا کو اس قدر عزیز رکھتے" دل نے جواب دیا۔

"یہ غلط ہے۔ مونا ان کی بیٹی ہے۔" ذہن بحث پر آمادہ تھا۔
"مگر اس کا نام کچھ اور بھی ہو سکتا تھا صرف مونا ہی کیوں ——؟" دل نے سوال کیا۔
"ہاں۔ یہ ٹھیک ہے۔ مونا ہی کیوں رکھا اس کا نام" تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ضیاء نے دنیا داری بھی نبھائی اور رسم وفا بھی" ذہن سمجھ چکا تھا۔
"چائے لیجئے ——" ہما نے کہا۔ "آپ کچھ سوچنے لگیں۔
"جی نہیں۔ کچھ نہیں —— اس نے حنا کو چوم لیا۔

دل کے ٹکڑے بکھر چکے تھے۔ کہاں سے سمیٹ سمیٹ کر لاتی وہ۔ قدرت کا عجیب انصاف تھا۔ دامن ہاتھ آیا بھی تو اس وقت جب تار تار ہو چکا تھا۔ لمحے زہر بن گئے۔ وقت ناگن کی طرح ڈسنے لگا۔ تنہائی ——۔ کانٹوں کی چبھن لے آگئی۔ ہما اور حنا سے ملاقات

تشنگی کو سیراب کرتی رہی۔ پھر وہ جان لیوا صبر آزما وقت آ گیا۔ جب حنا کی سالگرہ تھی اور ضیا، آنے والا تھا۔ حنا نے قسم ڈال دی تھی کہ وہ ضرور آئے۔

رات بھر انگاروں کی سیج پہ لوٹتی رہی۔ دماغ کی ساری شریانیں سوچتے سوچتے پھٹنے کو آ گئیں۔ آنکھیں بہتے بہتے سوکھنے کو آ گئیں، لب لرزتے لرزتے ساکت ہونے کو آ گئے۔

"ضیا، سے سامنا ہوگا تو کیا ہوگا ۔۔۔؟" یہی ایک سوال اس کے ذہن پہ ہتھوڑے سے برساتا رہا۔

آخر کار ۔۔۔ وہ اُٹھ بیٹھی اپنے آپ کو سنبھالا۔ ذہن نے معاملہ سُلجھا دیا اور دل نے بات مان لی۔ وہ ضیا، کے گھر کی طرف بڑھی۔

حنا سُرخ فراک میں گلاب کی طرح مہکتی پھر رہی تھی۔ مُونا کو دیکھ کر وہ تالیاں بجانے لگی۔

"HAPPY BIRHT DAY TO YOU" اللہ تمہیں نظرِ بد سے بچائے۔ ایسی کئی خوشیاں تمہارے دامن میں آئیں ۔۔۔ مُونا نے حنا کو چُوم لیا۔ یہ لو میری جانب سے برتھ ڈے کا یہ گفٹ۔" اُس نے ایک پیکٹ اس کے حوالے کیا۔

"چلئے نا آنٹی میرے ڈیڈی اندر ہیں۔ ممی بھی وہیں ہیں۔ حنا نے اُسے کھینچا۔

نہیں مُونا پہلے تم ممی کو یہاں بُلا لاؤ پھر میں تمہارے ساتھ اندر چلوں گی" اُس نے کہا

"اچھا ۔۔۔" اور حنا تیزی سے اندر بھاگی۔

ممی ڈیڈی۔ چلو چلو جلدی باہر نکلو۔ میری آنٹی آئی ہیں۔ آپ کو باہر بُلانے کہا ہے۔ یہ دیکھو مجھے برتھ ڈے کا ایک اور یہ گفٹ دیا۔" حنا نے کہا۔ اور وہ لوگ باہر نکلے

کہاں ہیں تمہاری آنٹی ۔۔۔؟" ضیا، نے پائپ ہونٹوں کو لگا کر پوچھا۔

"یہیں تھیں کہاں چلی گئیں ۔۔۔" حنا اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔

"بی بی جی۔ وہ تو بٹیا رانی کو پیارے کہ اُن کے ہاتھ ملا یہ تحفہ دے کر چلی گئیں"
مالی نے کہا۔

"چلی گئیں۔ ؟ ارے ایسا کیوں ضیا نے حیران ہو کر کہا" دیکھو تو
میں کیا ہے۔ ہما تیزی سے پیکٹ کھولنے لگی۔ اندر سے کاغذات کا ایک
نکلا۔ یہ مکان کے کاغذات تھے اور دو چار بنک کی پاس بکس بھی تھے
ہنڈل کے اوپر ایک چھٹی لگی تھی جس پر لکھا تھا۔
"مونا کے لئے ـــــ مونا کی جانب سے"
ان دو لفظوں کے درمیان کی جگہ پر کوئی نشان تھا شاید آنسو کا قطرہ
سوکھ گیا ہو۔ ساتھ ہی چھٹی بھی ملی۔ لکھا تھا۔

ضیا!!

میں ہما اور حنا سے مل چکی ہوں۔ حنا جسے تم مونا کہہ کر بلاتے ہو تمہارے
پیار کا اَن مٹ نقش ہے۔ میں نے تمہیں غلط سمجھا، محبت کی تابناکی میں
لی۔ وفاؤں کا انداز سمجھ لیا۔ خلوص کے پیمانے کو پرکھ لیا۔ زندگی صرف محبت
اور بھی ہے ـــ تم نے مجھے بہت دُور تک پہونچا دیا۔ میرے تخیل کی
جہاں تھم گئی تھی تم اُس سے بھی پرے نکل گئے ضیا ـــ میں دردِ بیکراں
اتھاہ سمندر میں ڈوب کر نئی زندگی پا رہی ہوں۔ یہ نہ سمجھو کہ میں خودکشی کر

غم حیات سے لطفِ حیات ملتا ہے
غم حیات کا حاصل نہیں ہے مر جانا

زندگی سے فرار حاصل کرنے کا جذبہ اب مجھ میں نہیں رہا۔ میں درد
کی مداوائے غم کروں گی۔ غم لوں گی، خوشیاں بانٹوں گی، خدمت کروں گی،

کروں گی۔ آخری دم تک انسانیت بن کر جیوں گی۔ دعا کرو کہ بعد میں حوصلہ اور ہمت رہے۔ پچھلے تیس برسوں سے جن تجربات سے دوچار ہوئی ان کا موازنہ کرتے ہوئے یہ کہہ سکتی ہوں کہ غمِ حیات نے مجھی لذّتِ لازوال بخشی ہے اور میں یہ سمجھ کر خاموش ہوں سے

غمِ حیات کی عظمت کو کوئی کیا جانے
بہار دے کے خریدے گئے ہیں ویرانے

لیکن ضیار یہ ویرانے ہیں جو میری تنہائی میں آباد رہیں گے۔ میری مونا کو تمھاری مونا کا پیار پہونچا دو۔ تیما لائقِ تحسین ہے۔ اُسے بھرپور محبت دو جس نے تمھارے گلشنِ زیست کو رونق بخشی، مونا کی تخلیق کی۔

تمھاری اور سب کی
مونا

ضیار کے ہاتھ سے کاغذ چھوٹ گیا۔ تیما خلاؤں میں پرواز کرنے لگی۔ جنا اپنی آنٹی کے حسین لمس کو یاد کر کے کھو گئی۔ فضا کچھ دیر بوجھل رہی۔ پھر محفل ایسی گرم ہو گئی جیسے کوئی آیا ہو اور نہ گیا ہو۔ حالانکہ حقیقت تو یہی تھی کہ جانے والا تہی دامن چلا گیا اور شاید اُس کے لبوں پر یہ صدا ہو کہ سے

ایک ساغر بھی عنایت نہ ہوا یاد رہے
ساقیا جاتے ہیں محفل تری آباد رہے

ایک شیشہ اور لوٹا

اُس نے گھبرا کر آنکھیں موند لیں۔

"نہیں پپّا نہیں ـــ" وہ دوڑ کر اُن کے قریب پہونچی۔

"شانو! میری بچّی"۔ اُن کی زبان لڑکھڑا نے لگی۔

"پپّا۔۔۔ کہیے کیا بات ہے"۔ اُس نے اُن کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔

"میری بچی! میں اپنا۔۔۔۔ فرض۔۔۔۔ ادا نہ کر سکا۔۔۔۔ مجھے معاف کرنا۔"

وہ رُکی رُکی سانسوں میں کہہ رہے تھے۔

"پپّا۔۔۔۔" وہ بلک پڑی۔

"شانو!۔۔۔۔ میں نے بڑے جتن کیے۔۔۔ ساری زندگی۔۔۔ تیری شادی کے خواب۔۔۔۔ دیکھتا رہا۔۔۔۔ مگر۔۔۔۔" وہ رُک گئے۔ ماحول کا سینہ شانو کی سسکیوں سے دہل رہا تھا۔

"مگر۔۔۔۔ مگر خواب بکھر گئے۔۔۔۔ ارمان بجھ گئے۔ شانو! زمانے نے مجھے دھوکہ دیا۔۔۔۔ جن سے اُمید تھی اُنھوں نے لوٹ لیا۔۔۔ شانو میری بچی۔۔۔ آہ۔

یہ بدنصیب باپ تجھ سے ... معافی مانگتا ہے ...۔" انہوں نے ہاتھ جوڑ دیئے اور مشانو کو یوں لگا جیسے کعبہ لرز رہا ہو وہ آنسوؤں میں نہا گئی۔

"پپّا۔ آپ کی قسم مجھے اس کا کوئی دکھ نہیں۔ قدرت جو بھی کرتی ہے اس میں بہتری ہی ہوتی ہے آپ اُس کی فکر کیوں کرتے ہیں۔ میں ساری زندگی آپ کی خدمت میں گذار لوں گی پپّا۔" وہ اُن سے لپٹ گئی لیکن دوسرے ہی لمحہ اُسے یوں لگا جیسے وہ برف بنی جا رہی ہو۔ اُس کا سارا جسم سُن ہو گیا۔ چند لمحوں بعد جب اُس نے سر اُٹھایا تو اُس کی گود سے دوسرا سر ڈھلک چکا تھا۔ بے نور آنکھوں میں ٹھہرا ہوا ایک آنسو اس بات کی گواہی دے رہا تھا کہ مرنے والے نے آخری سانس تک آنسو بہائے ہیں۔

"پپّا ـــــ" ایک دلدوز چیخ فضا میں اُبھری اور زمین نے اپنا سینہ شق کر لیا گویا ہر دُکھ کو اپنے دامن میں چھپانا ہی اُس کا فرض ہو۔

وہ کالج کے لان پر تنہا بیٹھی تھی۔ تنہائی نے یادوں کے بند کواڑ کھول دیئے۔ وہ پُرسکون صبح اُسے یاد آئی جب وہ اپنے ماں باپ کے ہمراہ نینی تال گئی تھی۔ یہاں کے حسین نظاروں، دلفریب کہساروں اور پاگل بادلوں کے بیچ رہ کر اُسے جنّت کا گمان ہونے لگا تھا۔ کتنے حسین دن تھے وہ بھی۔

پھر وہ ہولناک شام آئی جب اُس کی ممی نینی تال کی اُونچی اُونچی چوٹیوں سے پھسل کر گہری کھائی میں جا پڑیں۔ ممتا کا محل ٹوٹ گیا۔ اس کے پپّا دکھ سے نڈھال ہو گئے۔ اُس وقت وہ صرف دس سال کی تھی۔ شعور کی منزلیں اُس نے مکمل طور پہ طے نہیں کی تھیں لیکن یہ بات اُس کے تحت الشعور میں ایسے رچ بس گئی جیسے رگوں

میں دوڑتا ہوا یہ عنوان وہ زندگی کی اس کمی کو شدّت سے محسوس کر رہی تھی۔ سہیلیوں کے گھر جب وہ جاتی تو حسرت سے اُن کی ماؤں کو دیکھتی اور تب اُسے محسوس ہوتا کہ اُس کے دل کا ایک شیشہ ٹوٹا ہے۔

وقت گذرتا رہا، پر لگا کر اُڑتا رہا، منزلیں طئے ہوتی گئیں، نقشِ ناتمام مکمل ہوئے، آنے والے آتے رہے، قافلے بنتے اور بگڑتے رہے۔ خزاؤں نے بہاروں کو گلے لگایا اور بہاروں نے خزاؤں کو اپنایا۔ یہ سلسلۂ ہائے دراز چلتا ہی رہا۔ شانو شباب کی سرحدیں عبور کر رہی تھی۔ اُس کا نکھرا ہوا حُسن کسی گلشنِ رنگین سے کم نہ تھا۔ ایاز اُس کی زندگی میں نور بن کر بکھر گیا۔ ایاز جو اُس کی منزل تھا۔ اس کا رشتہ بہت پہلے ایاز سے طئے پا چکا تھا۔ ایاز اُس کے پپا کے دوست کا لڑکا تھا۔ اُس کے والد کا بھی وسیع کاروبار تھا۔ شانو کی اکثر شامیں ایاز کے ساتھ گذرتیں۔ اُس کی زندگی بہتی ندی کی طرح رواں تھی ہر صبح صبحِ بنارس، ہر شام شامِ اودھ اور ہر شب شبِ مالوہ تھی۔ زندگی کا سارا حُسن، ساری رعنائیاں وہ ایاز کے ساتھ مل کر لوٹ رہی تھی پھر یکایک جیسے بھونچال آ گیا۔ اس کے پپا کا بزنس بُری طرح ٹھپ ہو گیا اور کئی لاکھ کا دیوالیہ نکل گیا۔ اُسی شام ایاز کے والد نے شانو سے رشتہ توڑ دیا اور صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ "دنیا دولت کے بل پہ چلتی ہے جو دولت نہیں رکھتا اُس کو دنیا میں جینے کا حق نہیں۔ خان صاحب! پہلے دولت جمع کیجئے پھر بیٹی کی شادی کی فکر کیجئے۔ میں ایاز کو سکوں میں تولنا چاہتا ہوں کھوکھلی آرزوؤں میں نہیں"۔

شانو کے پپا کو دل کا دورہ پڑ گیا۔ وہ اس صدمے کی تاب نہ لا سکے۔ پھر ایک بار شانو کے دل کا شیشہ ٹوٹا۔ زخموں پر تیل ہی چھڑکا گیا۔ ممی کی موت کا گھاؤ ابھی مندمل نہ ہوا کہ پپا کی کشتیٔ حیات اُسے ڈولتی نظر آئی اُس وقت شانو نے

بڑی خوداعتمادی سے اپنی شرم کو بالائے طاق رکھ کر کہا۔

"مجھے ایاز پر بھروسہ ہے پپّا۔ آپ کی خاطر میں اپنا دامن پھیلاؤں گی" اور ہمیرشانو نے سچ مچ ایاز کا ہاتھ تھاما اور کہا۔" ایاز! میں اپنے لیے نہیں اپنے پپّا کے لئے تم سے بھیک مانگتی ہوں۔ اپنی محبت کا واسطہ میں نہیں دوں گی۔ پیار میں ڈوبے ہوئے اُن لمحوں کو نہیں دہراؤں گی۔ میں صرف اپنے پپّا کی زندگی کے لئے تمہارا تعاون چاہتی ہوں۔ دولت اور زندگی دونوں ایک ترازو میں رکھ کر دیکھو زندگی دولت سے کہیں زیادہ بھاری ہے۔ ایاز میرے اعتماد اور بھروسے کی لاج رکھ لو۔ پپّا کی زندگی کو تمہارے اقرار کی ضرورت ہے۔" شانو نے اپنا دوپٹہ پھیلا دیا۔

"شانو۔ میں تمہاری قدر کرتا ہوں..... ابا جان کے عقیدے سے تم واقف ہو۔ اُن کی ضد کے آگے میں مجبور ہوں۔ مجھے غلط نہ سمجھو"۔ شانو لرز کر رہ گئی بالکل اس زرد پتّے کی طرح جو ہلکی سی ہوا چلنے پر بھی جھڑ جانے کے خوف سے لرزتا ہے۔ پھر اُس نے پھیلا ہوا دوپٹہ سمیٹ لیا جیسے ساری آرزوئیں اور اُمیدوں کو یکجا کر لیا ہو۔

"مجھے تم سے اب کچھ نہیں کہنا ہے" اور پھر وہ واپس چلی آئی، پھر ایک بار اُس کے دل کا شیشہ ٹوٹا جھوٹی ہنسی چہرے پر لاکر اُس نے اپنے پپّا کو غلط بتایا کہ ایاز راضی ہو چکا ہے لیکن اُسی لمحے کوئی آبدار موتی اُس کی پلکوں پہ چمکا جسے بوڑھی نظروں نے دیکھ لیا اور پھر دل کا مریض جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔

"آہ..." ایک تڑپتی ہوئی آواز اُس کے وجود کی گہرائی سے نکلی اور فضاؤں میں گم ہو کر رہ گئی۔ وہ ماضی کے خواب سے چونک اُٹھی۔

کالج ختم ہو چکا تھا سب واپس جا رہے تھے۔ وہ بھی اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"معاف کیجیے گا.... شاید.... یہ آپ کی کتاب ہے۔" مجیدا اس سے مخاطب تھا

جنید جو ہمہ وقت پلکوں پر دل لئے اُس کی جانب دیکھتا ہی رہتا کہ شاید کبھی نگاہِ کرم ہو جائے
"جی ہاں۔ شکریہ۔"

"سُنیئے۔۔۔" جنید نے آواز دی۔ وہ رک گئی اور جنید کو محسوس ہوا جیسے وقت تھم گیا ہو، کائنات کی نبض رک گئی ہو۔

"گھر جا کر ابھی اس کتاب کے اوراق اچھی طرح دیکھ لیجئے گا کہیں کھو نہ گئے ہوں۔"
وہ اتنا کہہ کر آگے بڑھ گیا اور رشا لو بڑی دیر تک اس بات پر غور کرتی رہی۔ گھر جا کر جب اُس نے کتاب کے اوراق اُلٹ پلٹے تو ان کے درمیان گلاب کی کلی ملی جس کی ہر پتی پر سیاہی سے محبت لکھا تھا اور اُسی صفحے پر نیچے درج تھا۔

"اگر اس کا جواب "محبت" ہی ہے تو یہ کلی پھول بن سکتی ہے ورنہ اسے اسی کتاب میں مرجھانے دیجئے۔" منتظر نگاہِ کرم
جنید

وہ سوچ میں پڑ گئی۔ دوسری صبح جب وہ کالج گئی تو جنید کالج کے صدر دروازے پر ہی کھڑا تھا۔

"کل کی گستاخی کی سزا چاہتا ہوں۔"

جنید صاحب۔ آپ مجھے غلط سمجھ رہے ہیں۔ طوفان کے تھپیڑے کھائی ہوئی کشتی کناروں پر بھی لرزتی ہوئی بڑھتی ہے کہ پھر کہیں کوئی طوفان نہ آ جائے۔"

"سچ پوچھئے تو کشتی کو منزل تک پہنچنے کے لئے طوفان میں ڈوبنا اور اُبھرنا، بھنور میں پھنس جانا اور نکلنا ضروری ہے۔ اسی میں تو زندگی کا لطف ہے۔"

"یہ صرف افسانوی باتیں ہیں جنید صاحب عملی میدان میں یہی باتیں ساکت ہو کر رہ جاتی ہیں۔"

"یقین نہ ہو تو آپ مجھے آزما سکتی ہیں۔"

"لیکن اس کی ضرورت ہی کیا ہے؟"

"اس لیئے کہ آپ کو کعبۂ دل کا صنم بنایا ہے اور سجدے کی اجازت مانگتا ہوں۔"

"جو خود ساری زندگی سجدہ ریزی میں گذار چکا ہے اس کے آگے سجدوں کی اہمیت ہی کیا۔"

"میں آپ کی نہیں اپنی بات کر رہا ہوں اس پھیلے ہوئے دامن میں انکار کے پتھر نہ ڈالیئے میں انہیں سے اپنے وجود کو لہولہان کر لوں گا۔"

"لیکن میں مجبور ہوں۔ ﷲ مجھے پریشان مت کیجئے" شانو تیز قدموں سے آگے نکل گئی۔ جنید اس کے قدموں کی چاپ سنتا رہا۔ خاموش نگاہوں سے اس ڈھول کو دیکھتا رہا جو اُس کے قدموں کی حرکت سے آہستہ آہستہ اُڑ رہی تھی۔ پھر دن گذرنے لگے۔ شانو نے بی، اے مکمل کر لیا۔ جنید بھی گریجویشن کر چکا۔ ریزلٹ کے بعد وہ پھر شانو سے ٹکرایا۔

"میں نے کہا نا جنید صاحب۔ ایک دل صرف ایک ہی کیلئے دھڑک سکتا ہے مجھے تنگ نہ کیجئے۔"

"میں آپ کو تنگ نہیں کرتا۔ صرف اس کی اجازت چاہتا ہوں کہ ساری زندگی صرف آپ کی حسرت ہی میں جی سکوں۔"

"یہ بات بالکل غلط ہے۔" وہ جھنجھلا گئی۔

"جو تمنا جو خواہش، ہوک کی طرح اچانک دل میں اُٹھ جائے وہ غلط بھی ہو تو حسین لگتی ہے اس سے تو زندگی میں رچا ہے۔"

"آپ میرے بارے میں کچھ نہیں جانتے ـــ" شانو نے کہا۔

"سب کچھ جانتا ہوں۔ اُس زخم کا نام بھی بتا سکتا ہوں جس نے آپ کے دل میں

پناہ لی ہے ایاز"۔
"لیکن... لیکن آپ کیسے جانتے ہیں"۔
"موتی کی تلاش اگر ہو تو غوطہ زن سارے سمندر کی گہرائی ناپ لیتا ہے۔ آپ بھی تو ایک گوہرِ آبدار ہیں"۔ جنید نے کہا۔
"سب کچھ جانتے ہوئے آپ ..." وہ رک گئی۔
"ہاں ـــ آپ سے پیار کرتا ہوں"۔ جنید نے آخر کہہ دیا۔
"اگر اس کے جواب میں میری جانب سے کچھ نہ ملے تو ـــ؟"
"نہ سہی۔ پجاری کے لئے تو یہی بہت ہے کہ جس دیوی کی وہ پوجا کرتا ہے وہ اُسے درشن دیدے۔ میں صرف آپ کو نگاہوں کا سرمہ بنا کر جی لوں گا"۔
"آپ بھی عجیب ہیں"۔ شانو حیرتوں کے ساگر میں ڈوب گئی۔
"بس اتنی عنایت کافی ہے"۔ جنید مودبانہ سلام کر کے آگے بڑھ گیا۔

دو سال اور گذر گئے۔ شانو ایک پرائیویٹ اسکول میں ٹیچر ہو گئی اور جنید ایک کمپنی میں ملازم ہو گیا وہ ہر روز صبح شانو کو اسکول جاتا ہوا دُور سے دیکھ لیتا سر جُھکا کر سلام کرتا اور پھر اپنی سیکل کا رُخ کمپنی کی جانب کر دیتا۔ یہ سلسلہ یونہی چلتا رہا۔ شانو اُس کے سلام کا جواب دیتی اور گذر جاتی۔ آخر کار متواتر سجدوں نے لاج رکھ لی۔ بار بار کی ضرب سے تو لوہا شکل بدل دیتا ہے اور پھر شانو تو عورت تھی۔ جنید کا پیار رنگ لایا۔ شانو کے ویران آنگن میں محبت کا پھول کِھلا اور اُس نے جنید سے ہار مان لی۔

"میں تم سے منسلک ہونا چاہتی ہوں ساری زندگی کے لیے"۔ شانو نے

ہاتھ بڑھایا۔

"سچ شانو!!" جنید نے فرطِ مسرت سے اُس کا ہاتھ تھام لیا اور پھر دونوں رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو گئے۔ شانو دلہن بن کر جنید کے گھر آ گئی۔ مسرتوں کے دیپ جل اُٹھے، پیار کے جگنو جھلملانے لگے۔ تمناؤں کے قدیم رنگت سے سنور اُٹھے۔ آرزوؤں کی پائل چھنک اُٹھی۔ امیدوں کے کنگن کھنکنے لگے، نصیب کے ماتھے پہ افشاں چمکنے لگی۔ دھنک کے دل نشین رنگوں نے شانو اور جنید کو رنگ دیا۔ پہلی بار شانو نے جانا کہ دل کیسے دھڑکتا ہے، آنکھوں میں دیپ کیسے آتے ہیں، پلکوں کی چلمن بے قرار کیوں ہوتی ہے، ہونٹوں کی مسکراہٹ جیسے کیا پیام کب دیتی ہے۔ عارض کے گلاب کب مہکتے ہیں، زلفوں کی گھٹائیں کب گھر کر آتی ہیں۔ اپنا وجود معطر کیسے ہوتا ہے۔ وہ پہلی بار اس بے پناہ خوشی سے آشنا ہوئی تھی۔ ورنہ زندگی نے عین شباب میں اُس کی راہوں کو خاردار کر دیا تھا۔ [illegible] کی جھلسی آرزوؤں پہ خاک اُڑائی تھی۔ جنید کی بانہوں کو وہ اپنی زندگی کا ساحل سمجھ رہی تھی۔ اُسے یقین تھا کہ اب کوئی طوفان نہیں آئے گا۔ چند ماہ اور گزرے، وقت نے پاؤں آگے بڑھا دیا۔ پھر اُن کے گلشنِ زیست میں ایک گلاب مہکا۔ شہزاد۔

اُس کی کلکاریاں گھر کے آنگن میں گونجتی رہیں۔ شہزاد شانو اور جنید کی زندگی میں چراغ کی لو بن کر آیا جس کی روشنی دونوں کو راہ دکھا رہی تھی۔ عمر کی ڈور دراز ہوتی گئی۔ کلیاں چٹکیں اور پھول بنیں۔ شہزاد پانچ سال کا ہو گیا۔ جنید کی ترقی ہوئی اور شانو نے نوکری چھوڑ کر گھر ہی سنبھال لیا۔

پھر ایک دن وہ آیا جب جنید کو کسی ضروری کام کے تحت نینی تال جانا پڑا۔ نینی تال کے نام سے شانو کے دل میں کوئی چھوٹی لہری یا چٹکیاں لینے لگی۔ یہ وہی تو تھا جس نے اُس کا

کی ممی کو چھین لیا۔

"نہیں ۔۔۔۔ آپ ایسی تالی نہیں بجا سکیں گے" شالو لرز کر بولی۔

"تم تو پاگل ہو ۔ ایسے مقام پر جا نے سے روکتی ہو مجھے" جنید نے مسکرا کر کہا۔

"نہیں پیا ۔ مجھے اس نام سے وحشت سی ہوتی ہے۔ میری ممی وہاں گئیں اور لوٹ کر نہیں آئیں" اس کی آنکھوں میں وہم اور خوف کی پرچھائیاں رقص کر رہی تھیں۔

"نہیں شالو ۔ ایسی فرسودہ باتیں نہ کیا کرو۔ میں تو جا رہا ہوں چھ روز میں واپس آ جاؤں گا۔ میرا جانا بہت ضروری ہے" اور پھر جنید سچ مچ چلا گیا۔ شالو سہم کر رہ گئی۔

چار دن گذر گئے ۔ یہ چار دن شالو کے لئے چار صدیوں سے کم نہ تھے۔ جنید کے جانے کے بعد شالو محسوس کر رہی تھی کہ زندگی تھپتا صحرا ہے جس میں اس کا وجود بھٹک رہا ہے اور اس وقت وہ واقعی لرز کر رہ گئی جب اس کے ہاتھوں میں جنید کی موت کا ٹیلیگرام آیا۔

اس نے محسوس کیا کہ اس کے دل کا ایک شیشہ اور ٹوٹ گیا ہے اس کی چبھن انگ انگ میں محسوس ہونے لگی ۔ آنسوؤں کا تیز ریلا آبشار کی طرح رواں ہوا اور گالوں سے بہہ کر زمین پر آ گرا۔ وہ ایک سسکی لے کر یوں چپ ہو گئی جیسے بجتا ہوا ستار کسی تار کے ٹوٹ جانے پر دم توڑ دیتا ہے۔

"ممی لوٹو نا ۔ ۔ ۔" ممی شہزاد اس کے پیروں سے لپٹا ہوا تھا اس وقت شالو نے محسوس کیا کہ وہ صرف بیوی ہی نہیں بلکہ ماں بھی ہے۔ ماں ۔۔۔ کتنا امرت بھرا ہے اس لفظ میں، کتنا سکون ہے ان تین حرفوں میں۔ فلک کی رفعت، سمندر کی وسعت، کوہ کی بلندی، گھنے درختوں کی چھاؤں، چشمے کی ٹھنڈک، ہواؤں کی خنکی، ابر کا سایہ، دھرتی کا سینہ، ان سب کو یکجا کر کے قدرت نے اس عظیم ہستی کی تخلیق کی جس کو ماں کہتے ہیں وہ اپنے نام کی گہرائی میں ڈوب گئی۔

کو سہارا باندھا اور سمیرہ بہو بن کر آئی۔ سمیرہ دولت مند باپ کی مغرور لڑکی تھی۔ شہزاد کی
آنکھوں میں چمکتے ہوئے پیار کے جگنو شانو نے دیکھے اور اس کی خوشی کے لئے نواب
احتشام کے آگے دامن پھیلایا۔ مگر سمیرہ شانو کی عظمت کی معترف نہ ہو سکی۔ وہ یہ
نہ جان سکی کہ ایک ماں اپنی اولاد کے لئے کیا کیا گذرتی ہے اس نے تو صرف یہی سمجھا
کہ وہ ایک دُرِ نایاب ہے جس کو پانے کے لئے شانو نے نواب احتشام سے بھیک
مانگی ـــ کاش وہ جان سکتی کہ ماں تو کبھی کبھی اپنے بچوں کے لئے خود کو خیرات میں
دے دیتی ہے لیکن شانو کو سمیرہ سے گلہ نہ تھا۔ وہ شہزاد سے دکھی ضرور تھی
جس نے اس کی ہستی کو نظر انداز کرنا شروع کیا تھا۔ اس کی آنکھوں کے دیئے مدھم
ہو رہے تھے۔ اس کی سیاہ زلفیں سفید ریشم میں بدلنے لگیں۔ رات بھر وہ جاگتی
غم کی جلتی اور تنہائی کے الاؤ میں جلتی مگر کسی کو اتنا ہوش نہ تھا کہ اس کے دکھ کا
مداوا کرے سب اپنی اپنی خوشیوں میں مگن تھے۔

"جنید ـــ دیکھو تو تمہارا بیٹا کتنا خوش ہے تمہاری بہو کتنی خوش ہے۔ میں نے اپنا فرض
پورا کیا تم مجھ سے ناراض تو نہیں ہونا! لیکن میں ـــ میں کیوں اداس ہوتی جا رہی ہوں"۔
اور پھر اس کی آنکھوں سے موتی گر کر ٹوٹنے لگتے وہ اندھیروں میں ان موتیوں کو سمیٹنے لگتی
مگر وہ ٹوٹ جاتے اور اس کے ہاتھ گیلے ہو جاتے۔

وقت آگے ہی آگے چلتا رہا۔ پھر اچانک ایک ملگجی شام کو شہزاد آیا۔

"امی ـ میں اور سمیرہ امریکہ جا رہے ہیں ہماری سیٹیں بک ہو چکی ہیں" جیسے بم کا دھماکہ
کسی ویرانے میں گونجے۔ شہزاد نے کہا اس غیر متوقع حملے کی شانو کو امید نہ تھی۔

"کیا ـــ؟" وہ کچھ دیر تک خود کو بے جان سمجھتی رہی لیکن جب دل کی دھڑکن نے شدت
اختیار کی تو وہ یہ مشکل کہہ سکی۔

"شہزاد۔ خونِ جگر سے سینچا ہوا درخت جب ٹھنڈی چھاؤں دینے کے قابل ہو جاتا ہے
تو راہرو اس میں پناہ لیتے ہیں اور میں ۔۔ میں تو وہ زمین ہوں جس پر یہ درخت کھڑا ہے۔"

"ممی۔ آپ کی فلسفیانہ باتیں میری سمجھ سے باہر ہیں۔"

"شہزاد۔ تم مجھے چھوڑ کر چلے جاؤ گے ۔۔۔" شانو اُمڈی چلی آ رہی تھی۔

"ممی۔ آپ سمجھتی کیوں نہیں۔ یہاں رکھا ہی کیا ہے۔ اگر میں امریکہ چلا جاؤں گا تو قسمت بدل
جائے گی۔ سمیرہ کی بھی یہی خواہش ہے کہ ہم اپنی شادی کی پہلی سالگرہ وہاں منائیں۔ یہاں
ساری زندگی محنت کر کے اتنا نہ کما سکوں گا جتنا وہاں مجھے صرف ایک سال میں ملے گا
اور پھر وہاں SETTLE ہونے کے بعد آپ کو بلوا لیں گے۔" شہزاد نے جھوٹی تسلیوں کا آشیانہ
بنانا چاہا۔

"شہزاد۔ تم دولت کمانے کے لئے اپنی ماں کو بھی چھوڑ کر جاؤ گے" شانو نے اپنے وجود
کو منوانے کی کوشش کی۔

"میں وہاں جا کر آپ کو بلوا لوں گا۔" شہزاد پیچھا چھڑانے کی فکر میں تھا۔

"بیٹا۔ تم ہلال سے بدرِ کامل بن گئے اور اب جب مجھے اجالوں کی ضرورت ہے تم گھٹاؤں
میں چھپ رہے ہو۔ میں نے تم کو اس لئے اتنا بڑا تو نہیں کیا تھا نا! کہ تم مجھے چھوڑ کر چلے جاؤ۔
میں تمہارے بغیر سانس کیسے پاؤں گی۔"

"ممی۔ آپ نے بھی وہی کیا ہے جو ہر ماں کرتی ہے۔ کیا آپ مجھ سے اپنے احسانوں کا معاوضہ
طلب کر رہی ہیں۔ کیا ہر ماں اپنے بچوں کے روشن مستقبل پر اپنی ممتا کی مہر لگا دیتی ہے۔ وہ تو
اس کا فرض ہی ہوتا ہے۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو شہزاد۔ تم وہاں جاؤ گے، دولت کماؤ گے۔ تمہارا مستقبل سنور جائے
گا۔ جاؤ بیٹا ضرور جاؤ۔ میری عمر ڈھل گئی ہے نا! اسی لئے سٹھیا جاتی ہوں۔ بھلا سوچو تو

کانٹوں سے دل کے چاک سیئے

وہ بہت دیر تک آئینے کے سامنے کھڑی خود کو مختلف زاویوں سے دیکھتی رہی۔ میک اپ ٹھیک تھا۔ لپ اسٹک کچھ گہری ہو گئی تھی۔ اس نے پاس پڑے رومال سے ہونٹوں کو ہلکے سے پونچھ لیا اور کہہ اٹھی۔

"یہ رہی نا کچھ بات" اب میر کا شعر صادق آجائے گا۔

نازکی اُن کے لب کی کیا کہیئے
پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

وہ گنگناتی رہی۔ پھر یکایک اسے یاد آیا۔ وہ پرفیوم لگانا تو بھول ہی گیا جس میں خوشبو نہ ہو۔ اس نے "ڈوڈو" اسپرے کیا۔ فضا خوشبو میں ڈوب گئی۔ وہ سانس روکے بہت دیر تک آئینہ دیکھتی رہی۔

"بی بی جی۔ ڈرائیور آچکا ہے۔" رام دین کی آواز پر اس نے سانس بحال ہوتے چھوڑ دیا۔ آنکھوں میں ساغر، لبوں پہ گلاب کی کلیاں، ابرو ہلال عید، گالوں پر شفق، گردن شاخِ گل۔ وہ سراپا غزل ہو گئی تھی۔ سبز رنگ کی ساڑھی میں رشک مکمل بہار بن گئی تھی۔ ادا سے دبیز سے اس نے شیلف سے کتابیں نکالیں، پرس سنبھالا

اور کمرے سے نکل گئی۔

"شفا بیٹی! سیٹھ رام سہائے کے یہاں ڈنر ہے۔ میں دیر سے لوٹوں گا" صوفے پہ بیٹھے نواب اشرف علی خان نے کہا۔

"BAD..." ــــــــ وہ ہاتھ ہلاتی ہوئی باہر نکل گئی۔

کار آرٹس کالج کے سامنے رک گئی۔ وہ شاہانہ بے نیازی سے کار سے اُتری اور گردن کو جھٹکا دے کر آگے بڑھی۔ نوجوان طلبہ نے راہ میں آنکھیں بچھا دیا۔ وہ قدم بڑھاتی رہی۔

"فلک پر کیوں ہیں ان کے نقش پا
ہم بچھا دیں زمیں پہ آنکھیں" ایک فرہاد نے صدا دی۔ وہ شاہانہ انداز میں مُسکرا کر آگے بڑھی۔

"کوئی مُسکراتا ہوا جا رہا ہے
زمانے کی رفتار کا رُخ بدل کر" ــــ ایک مجنوں نے آواز لگائی۔ اُس نے ادائے ناز سے ساڑی کا آنچل لپیٹ لیا۔

"کس کے ملبوس سے آتی ہے حنائی خوشبو
کس کے ہر سانس کی جنبش ہے گلاب آلودہ" ــــ ایک رومیو ہاتھ اُٹھائے کہہ رہا تھا۔ شفا نے تیکھی نظروں سے اُسے دیکھا۔

"ناصح کو بلاؤ میرا ایمان سنبھالے
پھر دیکھ لیا اس نے شرارت کی نظر سے" ــــ کوئی مہیوال اس کے آگے جُھکا کہہ رہا تھا
"ایڈیٹ" کہتی وہ کلاس روم میں داخل ہوئی۔ لیکن دوسرے ہی لمحے چونک اُٹھی۔
کلاس کی سب سے آخری بینچ پہ وہ بیٹھا تھا، وہی گہری نظروں والا۔ شفا نے ایک نگاہِ

غلط انداز سے اسے دیکھا اور پھر اسے یوں محسوس ہوا جیسے دو تیر اس کے دل میں چبھنے لگے ہوں۔ وہ تیز تیز پلکیں جھپکانے لگی۔ لیکن نظروں کی گہرائی کم نہ ہوئی۔ وہ یونہی دیکھتا رہا بےخوف و خطر وہ جھنجھلا گئی۔

"بیٹھ جاؤ شفا" نغمہ نے کھسکتے ہوئے کہا۔ وہ بیٹھ گئی اور نہ چاہتے ہوئے بھی اس نے شاخِ گل پیچھے گھما دی۔ گہری نظریں اب بھی اس کا تعاقب کر رہی تھیں۔

"میں تنگ آ گئی ہوں اس سے" وہ آنچل لپیٹتی ہوئی کہہ رہی تھی۔

"لیکن وہ بے چارہ اوروں کی طرح ستاتا نہیں، چھیڑتا نہیں، کستا، صرف دیکھتا رہتا ہے" نغمہ نے کہا۔

"کم بخت لب کھولتا نہیں، آنکھوں ہی کو زبان دے رکھی ہے" وہ ہونٹ کاٹتی ہوئی بولی۔

"شفا! تم نے مضراب کو کچھ سمجھا نہیں"

"میں تو بس سمجھتی ہوں انہیں حسن کے غلام، راہوں میں پڑے ٹھوکریں کھانے والے پتھر" شفا نے سر کو جھٹکا دے کر کہا۔

"کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے مس شفا کہ یہی پتھر صنم بن جاتے ہیں اور ان کا مقام حرمِ دل۔"

دفعتاً پھولوں کے کنج سے مضراب نکل آیا۔

"آپ ——————؟" وہ چونک اٹھی۔

"معاف کیجئے مس، یہ آپ کا بیڈروم نہیں کہ میں بلا اجازت اندر نہ آ سکوں، یہ تو گلشن ہے اور ہر ذی روح اس کی شادابی سے لطف اندوز ہونے آ سکتا ہے۔"

"چلو نغمہ ہم یہاں سے چلیں" اس کے چہرے پر خفگی کے آثار تھے۔

"تو غلط کہہ رہی ہے بیٹی! حسین کردار کا مالک کبھی فنا نہیں ہوتا۔" خان صاحب نے بہت گہری بات کہی۔

"اوہ ڈیڈی! آپ نے کہہ دیا نا۔ میں شادی صرف اسی سے کروں گی ورنہ ساری زندگی یونہی گذار دوں گی۔" وہ ناشتہ کی میز سے اٹھ گئی۔ خان صاحب کی آنکھیں بھر آئیں۔ یہ سوچ کر کہ شفا نے ان کی بے پناہ چاہت کو اپنی نامناسب ضد سے مجروح کیا۔

شفا کا موڈ بگڑ چکا تھا، پھر بھی وہ کالج کے لئے تیار ہو گئی۔ آج کالج میں تقریری مقابلہ تھا جس کا عنوان تھا "حسن"۔

مقابلہ شروع ہوا کئی طلباء اور طالبات نے حسن کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا، سب نے اسے سراہا۔ شفا ہوا کے دوش پر سوار تھی۔ اناؤنسر نے مضراب کے نام کا اعلان، ماحول پر سکوت طاری ہو گیا۔ وہ دھیمے دھیمے قدموں سے ڈائس کی طرف بڑھا اس نے مائیک سنبھالا اور ایک گہری نگاہ شفا پر ڈالی۔ شفا زیر لب مسکرائی، دل نے دھڑک کر کہا۔ اب تیری عبادت ہو گی۔ ماحول کی خاموشی کو چیرتی ہوئی مضراب کی آواز ابھری۔ اس نے تقریر کا آغاز اس شعر سے کیا۔

اک پرتو دلکش ہے خیالوں کے اثر کا
خود حسن حقیقت نہیں دھوکا ہے نظر کا

اس شعر کے ساتھ ہی سب چونک اٹھے، خاص طور پر شفا، مضراب کا ایک ایک لفظ شفا کے دل پر کوڑے کی طرح برسنے لگا وہ کہہ رہا تھا۔

حسن بے شک ایک دھوکا ہے، فریب ہے، خیالوں کے افق پر جگمگاتا ہوا وہ ننھا سا ستارہ ہے جو کسی بھی پل ڈوب سکتا ہے۔ بیگنتی سنبھال نفس انسانی کے ضبط کی آزمائش ہے۔ یہ وہ فتنہ ہے جس نے دنیا میں زہر گھولا۔ اچھے دلوں کو زنگ لگا دیا اور سکوں میں دشمنی کا۔ معصومیت کو بغاوت

سکھائی، سفید پوشی پہ دھبہ لگایا، محلوں کو کھنڈرات میں بدلا۔ زاہد کی ریاضت میں دیوار بنا۔ سوتوں کو جگایا اور قیامت بن کر قلب پہ چھایا۔ میں مانتا ہوں کہ یہ دلفریب ہے، توبہ شکن ہے، لیکن وہ شے کس کام کی جو فانی ہو۔ سیر دیر پا نہیں، لازوال نہیں، تو پھر اس کی عبادت کیوں؟ اس کی پرستش کیوں؟ اگر واقعی عبادت کی چاہ ہو، پوجا کی خواہش ہو، پرستش کی تمنا ہو تو اپنی نظر کی پرستش کرے جس نے معمولی شے کو بھی حسن اتفاق سے حسین بنایا ہے

حسن احساس کی ضرورت ہے
ذرہ ذرہ حسین مورت ہے

تو ہی معذور دیکھ سکے ورنہ
زندگی اب بھی خوب صورت ہے

حسن نظر ہو تو ذرہ ذرہ حسین ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو انسان رات کی سیاہی کو زلف سے، گرد راہ کو سرمے سے، آگ کے شعلے کو لب لعلیں سے، ویران صحرا کو نامراد دل سے، تپتی ریت کو جلتے بدن سے تشبیہ نہ دیتا ......"

ابھی مضراب کی تقریر ختم نہ ہو پائی تھی کہ شفا اٹھ گئی۔ ہال تالیوں کی گونج سے دہک گیا۔

"مس شفا، معاف کیجئے۔ میں نے محسوس کیا کہ میرے الفاظ آپ پر گراں گذرے حالانکہ میرا مقصد ......"

"مجھے معافی کی ضرورت نہیں۔ ہاتھ نہ لگیں تو انگور کھٹے ہی ہوتے ہیں۔ آپ کی تقریر میرے لئے صرف بکواس ہے۔" وہ آگ برساتی آگے نکل گئی

"شفا شہر چھوڑ کر جا رہی ہے۔" کسی نے مضراب سے کہہ دیا۔ اسے محسوس ہوا جیسے بجتے ہوئے ساز تھم گئے ہوں۔ وہ آخری سلام کے لئے اسٹیشن آیا۔

"مس شفا، آپ جا رہی ہیں، کہاں اور کیوں، یہ تو میں نہیں جانتا۔ لیکن ایک دوست کے ناطے خدا حافظ کہنے آیا ہوں۔ میرا یہ تحفہ قبول کیجئے گا۔" مضراب نے ایک ڈبیا اُس کی طرف بڑھائی۔ شفا نے مضراب کو دیکھا۔ اس بار پھر وہ اس کی گہری نگاہوں تلے دب گئی۔ ڈبیا ہاتھ میں لے لی، اُسے کھولا۔ اس میں گلاب کے چند کانٹے رکھے تھے۔

"یہ کیا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"یہ حسین نہیں لیکن حسن کے نگہبان ہیں۔ یہ چبھ کر اپنی موجودگی کا احساس دلاتے ہیں۔ یہ آپ کے ساتھ رہیں گے تو میں بھی آپ کے دل میں کھٹکتا رہوں گا۔ انہیں صرف کانٹے نہ جانیئے، یہ شاہراہِ حیات پر چلنے والے کے پیروں میں پڑے چھالوں کو خود جذب کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ تار تار کئے ہوئے دامنِ دل کی رفوگری کرنا بھی انہی کا کام ہے۔..." شاید وہ بہت کچھ کہتا، لیکن ٹرین پلیٹ فارم چھوڑ رہی تھی۔ شفا نے آخری بار مضراب کو دیکھا، یہ سوچ کر کہ وہ اُس تحفے کو اس کے منہ پر ہی پھینک دے گی۔ لیکن مضراب کی گہری نگاہ نے اس کے ہاتھ کی جنبش روک دی اور وہ اسے مٹھی میں بند کرنے پر مجبور ہو گئی۔

صحیفۂ حیات کے اوراق اُلٹتے رہے، تاروں کی سرگوشیاں جاری رہیں، غنچوں کی لب کشائی میں کوئی فرق نہ آیا۔ شبنم کے آنسو بہتے رہے، کرنوں کا جال پھیلتا رہا، زمین کی گردش جاری رہی۔ فلک کی بلندی قائم رہی، موسم بیتے، وقت گذرا، حالات بدلے۔ مضراب کا تقرر بہ حیثیت پرنسپل ایک مقامی کالج میں ہو گیا۔ اسٹاف میں

اکنامکس کے لیکچرر کی کمی کے باعث انٹرویو رکھا گیا۔ امیدوار آتے رہے اور پھر مس خان کی درخواست پیش ہوئی جس کے نچلے حصے پر تحریر تھا۔

"فوٹو اس لیے نہیں لگائی کہ اس نوکری کے لیے قابلیت کی ضرورت ہے صورت کی نہیں۔"

اضطراب بٹن دبا چکا تھا۔ اگلے ہی لمحے دروازہ کھلا اور سیاہ برقعے میں ملبوس ایک خاتون اندر داخل ہوئی۔

"آپ مس خان ہیں؟" اضطراب نے پوچھا۔

"جی۔"

"ایم اے آپ نے کس ڈویژن سے پاس کیا؟" اضطراب نے سوال کیا۔

"درخواست میں تفصیل درج ہے۔" آواز باریک تھی لیکن دلنشین۔

"اوہ!" اضطراب نے غلطی محسوس کی۔ "کیا آپ بتا سکیں گی مس خان کہ آپ نے برقعے کی ضرورت کیوں محسوس کی؟"

"پیدا ہوتے ہی جس طرح لباس کی ضرورت محسوس کی جاتی ہے اسی طرح میں نے آج برقعے کی ضرورت محسوس کی۔" لہجے میں یاس کا عنصر نمایاں ہو رہا تھا۔

"تو اس کا مطلب ہے کہ آپ برقعے میں ملبوس ہو کر مردانہ کالج میں لڑکوں کو پڑھائیں گی۔ کیا آپ کو یقین ہے کہ آپ کالج کے لاابالی اور باغی لڑکوں پر قابو پا سکیں گی؟" اضطراب نے سگریٹ سلگا کر پوچھا۔

"اس کا جواب وقت دے گا۔" جواب مختصر تھا۔

"دیکھیے مس خان ہمیں لیکچرر کی ضرورت ہے، کسی ایسی چیز کی نہیں جو مضحکہ خیز ہو جائے۔"

اضطراب کے چہرے پر ناگواری کے آثار پھیل گئے۔

شام کی سیاہی پھیل چکی تھی۔ پرندوں کا کارواں اپنے آشیانوں کی طرف پرواز کر رہا تھا۔ مضراب کے قدم بھی تیزی سے شفا کے گھر کی طرف بڑھنے لگے۔ گھر پہنچنے کے بعد اس نے زنجیر کھٹکھٹائی، دروازہ کھلا۔

"آؤ مضراب۔" شفا نے استقبال کیا۔ وہ دم توڑتے ہوئے مریض کی طرح اندر داخل ہوا۔ کمرے میں ایک طرف ٹیبل رکھا ہوا تھا جس پہ سفید چادر سلیقے سے بچھائی گئی تھی۔ پلنگ کے دائیں طرف ایک میز تھی۔ اس پر کاغذ کے خوشنما پھولوں کا گلدستہ تھا پلنگ کے بائیں طرف الماری کھڑی تھی جس سے لگا ہوا ایک آئینہ دیوار میں آویزاں کیا گیا تھا جس پہ کپڑا ڈال دیا گیا تھا۔ اس نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔

"تم اکیلی رہتی ہو؟" مضراب نے پوچھا۔

"نہیں"

"پھر؟"

"ابھی آغاز بھی نہیں ہوا اور تم اختتام تک پہنچ گئے۔" شفا درد میں ڈوبی آواز سے بولی۔

"ہوں" نہ چاہتے ہوئے بھی مضراب کے دل سے ایک آہ نکل گئی۔

"کیا پیو گے؟" شفا نے پوچھا۔

"وہی جام جو ان پیمانوں سے پیا کرتے تھے۔" مضراب نے گہری نگاہ شفا کی بے رونق آنکھوں پر ڈال کر کہا۔

"لو پی لو۔" آنسوؤں کی دو بوندیں آنکھ سے ٹپکیں۔ یہ انداز کچھ اتنا پُر اثر تھا کہ ماحول لرز گیا۔

"شفا! خدا کے لئے۔۔۔" مضراب آبدیدہ ہو گیا۔

ابھی سے کیوں چھلک آئے تمھاری آنکھ میں آنسو
ابھی چھیڑی کہاں ہے داستانِ زندگی میں نے "

شفا نے شعر پڑھا، ماحول اداسیوں میں ڈوب گیا۔

"داستان کے آغاز سے پہلے میں بھی تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔" مضراب نے کہا۔

"کہو، میں ہمہ تن گوش ہوں۔" شفا نے جواب دیا۔

"تم میرے لیے آج بھی وہی ہو جو کل تھیں۔ میں نے تمھارے پھول سے عارض، گلاب کی پنکھڑیوں سے ہونٹ، ساغر سی آنکھوں، سیاہ گھٹا سے بالوں، بلور سے جسم سے پیار نہیں کیا تم سے۔ تمھاری روح سے، تمھاری پیاری شخصیت سے پیار کیا ہے۔"
مضراب نے شفا کے ہاتھ تھام کر کہا۔

"مضراب، تم جو کہہ رہے ہو وہ ایک خواب ہے اور جو دیکھ رہے ہو وہ حقیقت ہے۔ ذرا سوچو، تم سے پاؤں کے اس دریا کو کیسے پار کر سکو گے۔ یہ میرا غرور جس نے مجھے اس دوراہے پر لاکھڑا کیا جہاں آ کر میں مر سکتی ہوں نہ جی سکتی ہوں، میری حالت اس ہیرا کی سی ہے جس نے بیچ دریا میں آ کر دم توڑ دیا ہو۔ ایسے لمحے میں وہ ڈوب سکتا ہے اور نہ نکل سکتا ہے، صرف ہاتھ پیر مارتا کسمپرسی کے عالم میں رہ جاتا ہے۔" شفا نے جواب میں کہا۔

"تم یہ بھول رہی ہو شفا کہ اس پیراک کے دل میں ان حالات میں جینے کی موہوم سی تمنا بھی رہتی ہے، ایک آس بھی بندھی رہتی ہے کہ کاش کوئی بچا لے۔ میں تمھارے لیے وہی تمنا، وہی آس ہوں۔" مضراب کے اس جملے پر پہنچے تو شفا چونک اٹھی پھر بے اختیار اس کے سینے پر اپنا سر رکھ دیا۔ اس کی ہچکیاں شفا کو مرتعش کر رہی تھیں۔

"اب بتاؤ شفا یہ سب کیوں اور کیسے ہوا؟"

شفا نے اٹھ کر میز کی دراز سے البم نکالا اور مضراب کے حوالے کیا۔ مضراب البم کو

کے اوراق اُلٹنے لگا اور شفا صحیفۂ حیات کے اوراق کھولنے لگی۔

"ڈیڈی کا اچانک ہارٹ فیل ہونے سے چچا مجھے اپنے ساتھ بمبئی لے آئے۔ یہاں آکر میری خود ستائی اور بڑھ گئی۔ میرا غرورِ حسن بلندیوں کو چھونے لگا تھا۔ چچا میری شادی کی کوشش کر کے تھک گئے۔ لیکن میں اسی مثالی حسن کی تلاش میں تھی۔ پھر ثاقب سے ملاقات ہوئی۔" شفا رک گئی۔

منصور نے البم کا ورق الٹا۔ ایک بے حد حسین و دلکش نوجوان کا فوٹو چسپاں تھا۔

"یہی ثاقب ہے۔" شفا نے فسانۂ غم جاری رکھا۔ "میرا دل اس کے حسن کا اسیر ہو گیا۔ لیکن نہ جانے کیوں تمہارے دیئے ہوئے کانٹوں کی کھٹک اکثر محسوس کرتی۔ پھر چچا کی مرضی کے خلاف میں نے ثاقب سے شادی کر لی۔ ہم دونوں دہلی چلے گئے۔ وہاں ثاقب کے ان گنت دوست ملے اس کا ہر دوست میرے حسن کے قصیدے پڑھتا اور میں نشے میں سرشار رہتی۔ پھر ایک دن ثاقب نے سرگوشی کی۔

"مسٹر ورما نے یقین دلایا ہے کہ میں اس کمپنی کا ڈائریکٹر بن جاؤں گا اور ہو سکتا ہے اس کے بعد ہم امریکہ بھی چلے جائیں۔"

میں یہ سن کر خوشی سے پاگل ہو گئی۔ حیدرآباد، بمبئی اور دہلی میں تو میں نے اپنے حسن کا جادو جگا ہی دیا۔ اب امریکہ میں بھی میرے حسن کے قدردان ہوں گے۔

"یہ کب ہوگا؟" میں نے بے چینی سے پوچھا۔

"جب تم چاہو۔" اُس کی سرگوشی تیز ہوئی۔

"وہ کیسے؟"

"مسٹر ورما چاہتے ہیں کہ کل رات کلب میں تم اُن کی ڈانس پارٹنر بنو۔"

"یہ کونسی بڑی بات ہے۔ میں اس کے لئے تیار ہوں۔" میں نے ہامی بھر لی۔

لیکن یہ سب دھوکا ہی نکلا۔ ثاقب نہ ڈائریکٹر بن سکا اور نہ ہم امریکہ جاسکے۔ دو سال اسی طرح گذر گئے۔ مجھے اس زندگی سے نفرت ہونے لگی۔ پھر میں محسوس کر رہی تھی کہ قسمت میری حیات کے چمن میں پھول کھلانے والی ہے۔ میں خوش تھی، بہت خوش۔ لیکن مضراب اس خوشی کے پیچھے ایک پھانس ضرور ہوتی۔ شاید وہ تمھاری گہری نگاہ تھی۔ پھر ایک رات ایسی بھی آئی جب قدرت نے مجھے ماں بنا دیا۔ ایک ہنستے مسکراتے پھول نے زندگی کے چمن کو رشک فردوس بنا دیا۔ لیکن مضراب، عجیب سی بات ہوئی، بچے کی شکل تم سے بے انتہا ملتی جلتی تھی۔ میں حیران ہو گئی کہ کاتب کی تقدیر نے یہ کیا کر دیا۔ بچے کی نگاہ بھی اتنی گہری ہے۔ وہ مجھے دیکھتا تو محسوس ہوتا جیسے تم ہی ہو۔ ثاقب کا ذہنی ابال رہا۔ میں اس کی کھوکھلی باتوں کو محسوس کر چکی تھی۔ اس لئے میرے حسن کا غلط استعمال کرنا چاہا۔ اب میں ماں بن چکی تھی۔ مجھے اپنی ذمہ داری کا پورا احساس تھا۔ میں نے اس کا ہر حکم ماننے سے انکار کر دیا۔ اور پھر اس نے طیش میں آکر شراب کے نشے میں میرے چہرے پر تیزاب پھینک دیا اور کہا۔

”شفا، اب ساری زندگی تم تڑپو گی۔ لوگ تمھارے بھیانک چہرے کو دیکھ کر ڈر جائیں گے۔ تمھارا اپنا بچہ بھی تم سے دور بھاگے گا۔ سب تم سے نفرت کریں گے۔“ اتنا کہہ کر وہ چلا گیا۔ میں بے ہوش ہو چکی تھی۔ مجھے کس نے ہاسپٹل پہنچایا، یاد نہیں۔ جب ہوش آیا تو اپنا یہ بھیانک چہرہ دیکھ کر زندگی سے نفرت ہو گئی۔ لوگوں سے سنا کہ اسی رات ثاقب کسی ٹرک کے نیچے آکر ہلاک ہو گیا۔ قدرت اس سے انتقام لے چکی تھی۔ لیکن مجھے زندہ رکھ کر اس سے بھی زیادہ انتقام لیا۔ میں موت کی آرزو میں نکل کھڑی ہوئی کہ جبھی کسی نے میرا پلّو تھاما۔

”ممی۔۔۔“ یہ میرے بچے کی آواز تھی، میں نے اسے سینے سے لگا لیا۔ اس نے ایک

گہری نگاہ مجھ پہ ڈالی اور کہا۔
"ممی۔ تم مجھے چھوڑ کر کیوں جا رہی ہو؟ تم سمجھتی ہو میں تم سے ڈر جاؤں گا، نہیں ممی، مجھے تم سے ڈر نہیں لگتا۔ تمھاری گود میں سو کر مجھے اچھا لگتا ہے۔ تم میری ماں ہو نا۔ تم سب مجھے بہت اچھی لگتی ہو، بہت اچھی میری ممی!" اور اُس نے میرے گلے میں باہیں ڈال کر میرے جھلسے ہوئے ہاتھوں کو چوم لیا۔ کتنا گرم گرم پیار تھا اس کا، جیسے مجھے زندگی کی حرارت مل گئی۔ پھر میں نے اس کے لئے جینے کا عہد کر لیا۔ اپنے چہرے کو نقاب سے ڈھک لیا اور یہاں آ کر کام پہ لگ گئی۔ اتفاقاً تمھارے کالج کا اعلان پڑھا، اور پھر ۔۔۔

کہانی عمر بھر کی ہم نے یوں اک لفظ میں کہہ دی
کہ آنسو بن کے ٹپکا قصۂ غم مختصر ہو کر"

مضراب نے البم کا آخری ورق الٹ دیا۔ ایک طرف مضراب کی اپنی تصویر تھی اور اس کے بازو میں پپّو کی، جو ہو بہو مضراب کا بچپن تھا۔ اسی وقت پپّو باہر سے دوڑتا ہوا آ گیا۔

"ممی، یہ کون ہیں؟ تم نے نقاب کیوں نہیں ڈالی؟ اگر یہ تمھیں دیکھ کر بری کہیں تو مجھے اچھا نہ لگے گا۔" پپّو نے ایک سانس میں کہہ دیا۔

"نہیں بیٹا۔ ہم تمھاری ممی کو بری نہیں کہہ سکتے، تم انھیں اچھی کہتے ہو اس لئے ہم بھی انھیں اچھی کہتے ہیں۔" مضراب نے پپّو کے گال سہلا کر کہا۔

"لیکن یہ تو میری ممی ہیں، آپ کی کیا ہوتی ہیں؟" سوال معصوم ہونے کے ساتھ ساتھ بہت اذیت ناک بھی تھا۔ شفا نے مضراب کو اور مضراب نے شفا کو خالی خالی آنکھوں سے دیکھا، جیسے پوچھنا چاہتے ہوں، ہم کیا ہیں؟ ہمارے درمیان کون سا رشتہ ہے۔

"آپ سے میری التجا ہے پپّو کو اپنے ساتھ رکھئیے۔ اسے ایک باپ کے پیار کی
ضرورت ہے۔ آپ نے زندگی میں ایک بار مجھے تحفے میں کانٹے دیئے تھے اور کہا تھا۔ تار
تار کئے ہوئے دل کے دامن کی رفوگری ان کا کام ہے۔ میں آج ان جملوں کی تصدیق
چاہتی ہوں۔ یہ میری زندگی کی سوغات ہے جسے میں آپ کو پیش کر رہی ہوں۔ یہ
سمجھئے کانٹوں کے بدلے آپ کو تحفے میں پھول ملا ہے۔" شفا کے چہرے پہ بدنمائی کے
باوجود وقار جھلک رہا تھا۔

"تمہاری یہ سوغات آخری لمحے تک میرے ساتھ رہے گی۔ لیکن یہ پھول ڈالی سے
لگا ہوا ہی بھلا معلوم ہوتا ہے۔ میں چاہتا ہوں اس ڈالی کو اپنے ویران آنگن میں
لگالوں۔" مضراب نے پپّو کو قریب کھینچ کر کہا۔

"اس کے لئے مجھے سوچنے کا موقع دو۔" شفا نے جواب دیا اور مضراب دوسرے
دن آنے کا وعدہ کرکے چلا گیا۔

دوسری صبح اس کی نظر اخبار پر پڑی جس کے نچلے حصے میں ایک سرخی میں درج تھا۔

"کل رات موسیٰ ندی میں ایک نوجوان عورت کی لاش
پائی گئی جس کا چہرہ جھلسا ہوا تھا، جس کی بند مٹھی میں گلاب
کے چند کانٹے تھے۔"

اس خبر کو دیکھتے ہی مضراب بے تحاشا شفا کے گھر کی طرف چل پڑا۔ دروازے
کی دہلیز ہی پر پپّو بیٹھا رو رہا تھا۔

"انکل، ممی رات کو پانی لانے گئی تھیں ابھی تک نہیں آئیں۔ کہاں چلی گئیں وہ؟"
وہ مضراب سے لپٹ گیا۔ مضراب نے پپّو کو سینے سے لگالیا۔ دریائے موسیٰ اس کی
آنکھوں سے رواں تھا۔

آنکھوں سے ٹپکتا ہوا ہر آنسو اس بات کی گواہی دے رہا تھا کہ کانٹوں نے رفوگری کے ساتھ ساتھ دل کے ہر آبلے کو پھوڑ رہا ہے۔ وہ پیچ کو سینے سے لگائے آہستہ آہستہ اپنے گھر کی طرف چل پڑا۔

(بیسویں صدی، مئی ۱۹۷۶ء)

سسکتی چاندنی

ڈرائینگ روم سے آتے ہوئے قہقہے اس کے دماغ پر ہتھوڑے برسا رہے تھے۔ وہ چائے کی کیتلی چولہے پر رکھی سوچ رہی تھی ـــ انسان ہنسنا ہی کیوں پسند کرتا ہے۔ اور ہنستا بھی ہے تو اتنی شدت سے کہ دوسرے چونک جائیں۔ جبکہ دنیا میں آتے ہی منہ بسورنا زندگی کی علامت ہے۔ وہ سوچتی رہی یہاں تک کہ کیتلی کی اٹھتی ہوئی گرم بھاپ نے اسے احساس دلایا کہ پانی کھول چکا ہے۔ اس نے چائے بنا کر ٹرے میں رکھی۔ کچھ بسکٹ اور پھل پلیٹ میں جمائے اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ ڈرائینگ روم کے دروازے تک پہنچ کر وہ رک گئی۔

"آؤ چاند!" امی نے اسے پکارا۔ وہ پردہ ہٹا کر اندر داخل ہوئی۔ میز پر ٹرے رکھ کر وہ جانے ہی والی تھی کہ کسی نے اسے پکارا۔

"اوہو! تو یہ ہیں چاند صاحبہ؟ ذرا دیکھیں تو کتنی چاندنی ہے ان کے پاس" وہ لرز کر رہ گئی۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ یہ صباحت بھیا ہی تو تھے۔ کتنے بڑے ہو گئے یہ؟ وہ سوچنے لگی۔ بچپن میں تو یہ ہر وقت انگوٹھا منہ میں لئے ادھر سے ادھر

گھومتے پھرتے تھے۔ اور اب کتنا بڑا فرق آ گیا ہے ان میں۔ بالکل فلمی ہیرو کا سا انداز تھا ان کا!

"ارے بھئی! کیا سوچنے لگیں آؤ تو ـــــ" انہوں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا وہ سمٹ گئی۔ اس کی رگ رگ میں چنگاریاں دوڑنے لگیں۔ کتنا گرم ہاتھ تھا صباحت کا جیسے وہ پگھل جائے گی۔

مجھے کک .... کام ہے وہ بمشکل کہہ سکی اور بھاگ نکلی۔ باورچی خانہ میں آکر ہی اس نے دم لیا۔

"چاند لوگوں سے بہت کتراتی ہے!" عفو باجی کہہ رہی تھیں۔

"تو پھر جانوروں سے پیار کرتی ہوں گی!" یہ صباحت کی آواز تھی۔

ایک قہقہہ ان کے اس جملے پر ابل پڑا۔

"آپ بھی مذاق کرتے ہیں۔ وہ بیحد تنہائی پسند ہے!" باجی اس کی تائید کر رہی تھیں۔

"یہ تو ان کے نام کی خاصیت معلوم ہوتی ہے۔ چاند بھی تو اکیلا رہتا ہے" صباحت کہہ رہے تھے۔ لیکن ایک بات سمجھ میں نہیں آتا کہ اسے اتنا گہن کیوں لگ گیا۔ بچپن میں اس کا رنگ اتنا تو سیاہ نہ تھا۔"

وہ رکی رکی سانسوں سے سنتی رہی۔ اس میں اس کا قصور بھی کیا تھا۔ جانے اس رات چاند نکلا بھی تھا یا نہیں جس رات وہ پیدا ہوئی۔ اس پر ستم یہ کہ امی اور ابا نے بھولا ڈسے اس کا نام چاند رکھ چھوڑا۔ ہونہہ ـــــ چاند کتنا اجلا اجلا گورا گورا سا ہوتا ہے۔ اور میں جیسے کسی نے ہاتھ بھر کالک پر منہ پر تھلیپ دی ہو! وہ اپنے آپ پر جھلا گئی۔ اور یہ صباحت نہ جانے اپنے آپ کو کیا سمجھتے ہیں۔ بڑے آئے

انجینئر بن کر! وہ تصور میں ان کا منہ چڑانے لگی۔

اس رات امی، ابا، نزہت، نکہت اور عفو باجی صباحت کے ساتھ گپیں ہانک رہے تھے۔ لیکن وہ دور بیٹھی سویٹر بنتی رہی۔ رات کے گیارہ بجے جب سب اپنے اپنے بستروں پر جا چکے تب بھی باجی اور صباحت باتیں کر رہے تھے۔ وہ کئی بار کنکھیوں سے صباحت کو تاکتی رہی۔ کتنا اسمارٹ ہے یہ آدمی مگر ـــــ ہونہہ، اپنے آپ کو بہت قابل سمجھتا ہے! وہ جیسے کوئی یک بہ یک یاد آجانے سے جھنجلا گئی۔

"ارے بھئی چاند سنو تو ـــــ" صباحت نے آواز دی۔

"جی فرمائیے" وہ سلائیاں رکھ کر قریب آئی۔

"ہمیں ایک کپ چائے پلا دو نا" انہوں نے انگڑائی لیتے ہوئے کہا۔

وہ ان کے چوڑے چکلے سینے کو غور سے دیکھنے لگی۔ کتنا کشادہ ہے یہ سینہ! کاش وہ کبھی منہ چھپالے اس جگہ...

"نہیں بناؤ گی" ان کی آواز نے چونکا دیا۔

"ابھی لاتی ہوں" وہ مڑ گئی۔

"سنو تو دودھ زیادہ ڈالنا۔ چائے کا رنگ صندلیں ہو تو اچھا لگتا ہے ورنہ سیاہ رنگ تو زبان کے ساتھ ساتھ دل و دماغ کو بھی تلخ کر دیتا ہے" انہوں نے برا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔

وہ آگے بڑھ گئی۔

"بدتمیز کہیں کے ـــــ مجھ پر تیر چلا رہے ہیں۔ جیسے خود یوسف ثانی ہیں" وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑاتی ہوئی باورچی خانے کی طرف چل دی۔ چائے کی کیتلی چولھے پر چڑھا کر وہ پھر سوچ میں ڈوب گئی۔

آخر خدا کا یہ کون سا انصاف ہے۔ عفو باجی کو دیکھو جیسے پھولوں کے رنگ سے بنائی گئی گڑیا ۔ نزہت کا اجلا رنگ جیسے چاندنی چھٹک چلی ہو۔ نکہت کی کٹورا جیسی آنکھیں جیسے دو چھلکتے ساغر ہوں۔ اور ایک وہ ہے، گہرا سیاہ رنگ، آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی، بال الجھے الجھے سے، دانت ایکدم اُبلے جیسے اندھیرے میں ٹارچ کی روشنی، اسی لئے تو وہ ہنستی بھی کم تھی۔ عفو باجی ہنستی تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے انار چھوٹ گئے ہوں۔ گورے گورے گالوں میں ننھے ننھے بھنور۔ ان بھنوروں میں ایک خمدار لٹ جھولتی رہتی۔ جیسے یہ سانپ کسی کو ڈس لے گا۔ ایک دن اس نے بھی ایسے ہی بال بنائے تو شکور بھیا نے کتنی بیدردی سے اس کی لٹ کھینچی اور کہا خواہ مخواہ اندھیری راتوں میں بادلوں کو بلانے کی کوشش کر رہی ہو۔ وہ سسک پڑی۔ لیکن باجی نے اسے سینے سے لگایا اور کہا:

"چندا! تو روتی کیوں ہے۔ تیرا چہرہ، تیرا رنگ تو ابا کی طرح ہے نا! ہمارا کوئی بھائی نہیں۔ ہوتا تو وہ ضرور ابا کا ہم شبیہ ہوتا۔ اللہ نے تجھے ان کی شباہت دی ہے تو کیوں دکھی ہوتی ہے۔ جانتی ہے بڑی بوڑھیاں کیا کہتی ہیں؟ جو لڑکی اپنے باپ کی شباہت رکھتی ہے وہ بڑی خوش نصیب ہوتی ہے۔ اس کے لئے دلہا آسمانوں سے آتا ہے۔ اڑن کھٹولے پر بیٹھ کر۔ پگلی کہیں کی ـــــ" اور وہ باجی کے سینے سے لگی حسین خواب دیکھنے لگی۔ اسے اپنا نام ہی اچھا نہ لگتا تھا۔ نہ جانے دادی اماں کو کیا جنون آ گیا تھا جو انہوں نے اپنے بیٹے کی شباہت والی بچی کو دیکھ کر چاند پکارا اور وہ چاند آج تک گہن کا مارا رہا۔ دادی اماں جنت کی راہ لے چکیں، ابا کے چہرے پہ جھریاں آنے لگیں۔ امی کی معصوم صورت اب کچھ کرخت ہو گئی۔ شائد معاشی تکالیف کی وجہ سے باجی کا فائنل ایئر تھا۔ نزہت اور نکہت انٹر کر رہی تھیں۔

اور چاند گھر کی تعلیم سے آراستہ تھی۔

اس کی سوچ نے ٹھوکر کھائی۔ ــــــ "ارے میں چائے بنانا ہی بھول گئی۔ ؟"

اس نے جلدی سے چائے بنائی اور پیالی لئے دالان کی طرف چلی گئی۔ دروازے کے قریب پہونچ کر وہ رک گئی۔

صباحت باجی کے چہرہ کو دونوں ہاتھوں سے اٹھائے دیکھ رہے تھے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے انہوں نے کنول کا پھول ہاتھ میں لے لیا ہو

"کون ہے جو اس بت پہ ایمان نہ لائے! کافر بنانے کا الزام تمہی کو دے رہا ہوں اور خدائے حسن بھی تم ہی کو سمجھتا ہوں۔ میری بندگی قبول کر دگی"؟ صباحت کہہ رہے تھے باجی کی مخمور آنکھوں پہ حیا کی بوجھل پلکیں چلمن بن کر گری ہوئی تھیں۔

احسان مندہوں اس بت تراش کا جس نے گلہائے زنگا رنگ کا یہ گلدانہ میرے لئے رکھا۔ یعنت! کتنی لڑکیاں میں نے دیکھیں۔ لیکن ایسا حسن صبیح اور ایسا سحر انگیز شباب کہیں نہ مل سکا۔!" وہ باجی کی پلکوں پہ جھکے کہہ رہے تھے۔ چاند آگے نہ بڑھ سکی۔ اس نے کھنکارا اور آگے آئی۔ صباحت بھیا گھبرا کر ہٹ گئے۔ اور سردی کے باوجود باجی کی اجلی پیشانی پہ دمکتے موتی ستاروں کی طرح چمک اٹھے۔

"چائے لیجئے"! چاند نے صباحت کے آگے چائے کی پیالی رکھی اور واپس مڑ گئی۔

"کہیں چاند نے دیکھا تو نہیں" ــــــ؟ صباحت نے سرگوشی کی اور وہ دیوار کے قریب ہی کھڑی سنتی رہی۔

"دیکھ بھی لیا تو کہے گی نہیں۔ وہ میری بہن ہے۔ مجھے بہت چاہتی ہے۔ مجھے اس پہ پورا اعتماد ہے۔" باجی کی آواز آئی۔ چاند آگے بڑھ گئی۔ اس نے سوچا باجی مجھ پہ کتنا اعتماد رکھتی ہیں لیکن یہ بھی کیا زبردستی کہ کسی سے کہنا نہیں۔ اور اگر میں جو کہہ

دول تو ــــ ؟ ‘‘ اس کے دل نے پوچھا۔
’’نہیں وہ تجھے چاہتی ہیں۔ اپنی بھتی ہیں‘‘ پھر ــــ پھر میں کیا کروں؟‘‘ وہ بدبدائی۔ اس کے دل نے سرگوشی کی ’’خاموش رہو‘‘! ایسے ہی جیسے کچھ دیکھا نہیں جانا نہیں۔‘‘

اس نے ہلتے ہوئے ہونٹ بند کر لئے۔ وہ بستر پہ دراز ہو گئی۔ نیند کا کوسوں پتہ نہ تھا۔ اس نے کروٹ لی۔ صباحت کا چہرہ آگے آ گیا۔ کتنے حسین معلوم ہو رہے تھے، وہ جیسے بہار کا پہلا پھول ــــ اوںہہ! ــــ تو یہ بھی کوئی بات ہوئی۔ نہیں ــــ تو پھر ــــ؟ ہاں یاد آیا ــــ جیسے موتیا کی موٹی موٹی کلیوں کا بنا یا ہوا گجرا ــــ!‘‘ وہ تصور میں اس کی خوشبو سونگھنے لگی۔ لیکن ــــ میں، کون ہوتی ہوں ان کے لئے سوچنے والی۔؟‘‘ اس نے کروٹ بدلی۔ اس کا دل ابھی تک دھڑک رہا تھا۔

صبح سویرے ہی صباحت اس کے پلنگ کے قریب چلا آیا۔ اور لگا جھنجوڑنے۔ اٹھو گی یا ابھی بستر ہی پکڑ کر رہو گی؟ چاند تو سب کو روشنی دیتا ہے تم ہو کہ لحاف میں دبکی سب کو اندھیروں میں ڈبو رہی ہو!‘‘

’’مگر چاند تو شام کو نکلتا ہے۔ جب سارے اجالے سورج کی کرنوں سے پھیلتے ہیں، تو اس چاند کو کوئی نہیں پوچھتا جو رات کے چہرہ کو بے نقاب کر کے باہر آتا ہے اور ساری رات تنہا اتنے بڑے جہاں کی رکھوالی کرتا ہے۔‘‘ اس کا جی چاہا تب کچھ کہہ دے۔ لیکن کہہ نہ سکی۔ اس نے لحاف ہٹا کر پرے رکھا اور اُٹھ کھڑی ہوئی۔

’’دیکھو تو تمہاری باجی چولھے کے پاس آگ دہکا رہی ہیں‘‘۔ صباحت نے انگلی سے بتاتے ہوئے کہا۔ وہ آنکھیں ملتی ہوئی باورچی خانے کی طرف چل دی۔ باجی گیلی

لکڑیوں کو پھونک پھونک کر جلا رہی تھیں۔ اور دھوئیں نے انہیں اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔

"یہ آپ کے بس کا روگ نہیں" اٹھئے میں سنبھال لوں گی" اس نے باجی سے کہا اور چولھے کے قریب بیٹھ گئی۔

صباحت جب سے گھر آیا جیسے نکھار سا آگیا تھا۔ نزہت، عفّو باجی، امّی اور ابّا سبھی خوش تھے۔ سبھی کے چہروں پہ بہار کا سا یہ تھا۔ ایک چاند تھی ——— جو سب سے الگ تھلگ اپنی دنیا میں مگن رہتی۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ باجی اور صباحت دونوں اب زیادہ تر تنہائی میں ایک دوسرے سے بات کرنے لگے ہیں امّی اور ابّا کی ڈوبتی ہوئی معاشی حالت اس کی ذمّہ دار تھی۔ ایک دن اُس نے امّی اور ابّا کی سرگوشیاں بھی سنی تھیں۔

"اگر صباحت نے عفّت کو ہم سے مانگا تو ہم بلا تامّل ہاں کہہ دیں گے" یہ امّی کی آواز تھی۔

"اس کے علاوہ چارہ ہی کیا ہے بیگم! صباحت انجینئر ہے۔ پھر اپنا بچہ ہے۔ آخر عفّت کی شادی ایسے ہی تو نہ ہوگی۔ اُس کے لئے اچھا بر ڈھونڈنے کیلئے خود ہمیں لینے آپ کو بیچنا پڑے گا۔ اگر صباحت عفّت کو پسند کرتا ہے تو سمجھو کہ تم بہت آسانی سے اس فکر سے نجات پالوگی" ابّا سگریٹ پھونکتے ہوئے کہہ رہے تھے۔

وہ دیوار سے ٹیک لگائے ان کی سرگوشیوں کو سنتی رہی۔ اُس کے دل میں جیسے ہوک سی اٹھی ——— تو کیا صباحت باجی سے بیاہ کریں گے ——— ؟ ابھی ہی تو بات تھی۔ باجی حسین ہیں، تعلیم یافتہ ہیں۔ پھر ویسے بھی ان کی عمر بڑھتی جا رہی ہے لیکن . . . . لیکن یہ اس کے دل میں کسک کیوں ہونے لگی۔ صباحت میں ایسے کیا ہے

جڑے ہیں جو دل بار بار اُس کی چمک دیکھنے کیلئے تڑپ رہا ہے جبکہ وہ خود کبھی اس کی طرف نہیں دیکھتے۔

وہ سوچتی رہی لیکن لاکھ کوشش کے باوجود اُس کے دل نے صباحت کے بارے میں ہزاروں سوالات کر دیئے۔ وہ ہر سوال کا جواب ایک گھٹی ہوئی آہ، ایک دبی ہوئی سسکی اور ایک آنسو کی بوند سے دیتی رہی۔

وقت کا کارواں آگے بڑھتا رہا۔ زندگی کے ساز متحرک رہے۔ عفّو باجی اور صباحت ایک دوسرے کے قریب آتے گئے۔ نزہت اور نکہت انٹر پاس کر چکیں۔ چاند ابھی چولھے کے پاس ہی جل رہی تھی۔ امّی کی سوچ گہری ہو چکی تھی۔ ابا کے کمرہ سے جلے ہوئے سگریٹ کے ٹکڑے اس بات کی گواہی دیتے تھے کہ وہ ساری ساری رات جاگنے لگے ہیں۔ لیکن اس دن ـــ

اس دن جیسے گہری دھوپ کے بعد بارش کھل کر برس گئی۔ صباحت نے ابا سے کہہ کر عفّو باجی کو مانگ لیا۔ بغیر کسی مانگ کے اُن کی مانگ افشاں سے بھر گئی۔!

چاند آسمان کو گھورتی رہی۔ دُور خلا میں ایک شبیہ اُبھری۔ یہ صباحت ہی تو تھے۔ اونہہ ـــ مجھے کیا غرض اُن سے۔ اس نے سر کو جھٹک دیا، مگر دل ـــ یہ کمبخت دل ہی تو ہے جو آگے پیچھے دیکھے بنا دوڑتا جاتا ہے۔ نزہت اور نکہت عفّو باجی سے پیٹ پیار کر رہی تھیں۔ وہ چھوئی موئی کی طرح لجائی جا رہی تھیں۔

" چندا! تم میرے قریب نہ آؤ گی؟" عفو باجی کی آواز پر وہ چونک گئی۔
" باجی! میری عفو باجی! وہ جیسے سارے بندھن توڑ کر ان سے لپٹ گئی۔ اُسے یہ بھی یاد نہ رہا کہ اس کا اپنا نشیمن بننے سے پہلے ہی جل چکا ہے!

اس شام باجی سُرخ کپڑوں میں جگمگا رہی تھیں۔ صباحت بھیا نے اُنہیں

اپنا لیا تھا۔ ڈھولک سے گیت پھوٹ پڑے۔ تارے ہنسنے لگے۔ چاند ایک گوشے سے جھانک رہا تھا۔

وہ ان ہنگاموں میں مصروف رہی۔ جب باجی رخصت ہوگئیں، اس کے دل نے ایک طویل آہ کھینچی۔ چاروں طرف سناٹا نظر آنے لگا۔ وہ تھکی ہاری بستر پر گر پڑی۔ چھن چھن ۔۔۔۔۔ آنسو تکیے پر ڈھلتے رہے۔ "اللہ! یہ کیسی خوشی ہے جس میں دکھ ہی دکھ ہے"۔ وہ بے حد کربناک لہجہ میں کہہ اٹھی۔ لیکن جب دیر تک اس کا جواب نہ ملا تو اس نے مایوس ہوکر لحاف سے چہرہ ڈھانک لیا۔

عفو باجی کی شادی کو تین سال گزر گئے۔ ابا ڈھکولوں سے نجات حاصل کر چکے تھے۔ امی سفید ساڑی میں لپٹی تسبیح ڈھالنے لگیں۔ چاند آج بھی وہی تھی۔ ایک دن جو رشتہ چاند کیلئے آیا وہی نکہت کے حصّہ میں چلا گیا۔ چاند نے خوشی سے یہ فرض بھی انجام دیا۔ اور بارات کی واپسی کے بعد صاف لفظوں میں امی سے کہہ دیا۔

"امی! آئندہ پھر کبھی مجھے تماشہ نہ بناؤ۔ آپ کی خدمت کرتے ہوئے میں اپنی زندگی گزار سکتی ہوں۔ لیکن خدا کیلئے باربار آئینہ دکھاکر میرے دل کو مجروح مت کیجئے۔" امی نے اسے سینے سے لگالیا اور چپ سادھ لی۔

نزہت بغاوت پر آمادہ تھی۔ اس نے دھمکی دے رکھی تھی کہ اس کی شادی اگر شوکت سے نہ کی گئی تو وہ گھر چھوڑنے پر مجبور ہو جائے گی۔ چاند نے جب اسے سمجھایا تو وہ کہہ اٹھی "تم کیا جانو دنیا کسے کہتے ہیں۔ تمہاری کائنات چولہے اور چکی تک محدود ہے۔ عمر کی اٹھائیس بہاریں تم نے یوں ہی گنوا دیں۔ تم بھی چاہتیں تو ایسا ہو سکتا تھا۔ انور بھیا اتنے برے تو نہ تھے جو تم نے ان کے گال پر طمانچہ مارا۔"

"انور ــــــ" اس کے ذہن میں کھلبلی مچ گئی۔ وہ شرابی، غنڈہ، اوباش

زبردستی اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔ اگر میں چپ ہو جاتی تو کیا میری بھی زندگی بچاتی؟
ہونہہ! پگلی کیا جانے بارش ایک طرف کھیتوں کا منہ دھلاتی ہے تو دوسری طرف
اس سے کیچڑ بھی پیدا ہوتا ہے۔ جس کا ایک دھبہ بھی اجلے دامن کو داغدار کردیتا
ہے۔ اسجانہ نے سر کو ایک جھٹکا دیا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

اس شام بارش خوب کھل کر برسی تھی عفو باجی تکلیف میں مبتلا تھیں۔ میٹرنٹی
ہوم کے آپریشن تھیٹر میں حیات وموت کی کشمکش جاری تھی۔ امی تسبیح ڈھال رہی تھیں۔
صباحت کا برا حال تھا۔ چاند سفید دوپٹے کو چہرے کے گرد لپیٹے آسمان کے تکتے کھڑکی
باجی کی صحت کیلئے دعائیں مانگ رہی تھی۔ لیکن دعا کی ڈوری ٹوٹ گئی۔ امی کے ہاتھ سے
تسبیح کے دانے بکھر گئے۔ صباحت بھیا بلک اٹھے۔ ایک گول مٹول خوبصورت سے بچے کو جنم
دے کر باجی موت سے ہار مان چکی تھیں۔

"گڈو" وہ دیا تھا جس کی روشنی میں تین زندگیاں سانس لے رہی تھیں۔ صباحت
بھیا زندہ تھے تو گڈو کیلئے، امی جی رہی تھیں تو گڈو کیلئے۔ چاند ہنس رہی تھی تو
گڈو کیلئے!

مرنے والے کا فاتحہ سیوم سے لے کر چالیسویں تک دن کچھ مشکل سے کٹتے ہیں اس
کے بعد تو جیسے وقت پر لگا کر اڑ جاتا ہے۔

چاند! حوادث زندگی کو خاموش تماشائی کی نظر سے دیکھتی رہی۔ شکوہ کرے
بھی تو کس سے۔ جب کارساز جہاں خود منہ موڑ لے۔ صباحت کو اس نے دل کی گہرائیوں
سے چاہا۔ اس کی پوجا کی۔ لیکن عفو باجی کے حسن نے انہیں چاند سے چھین لیا۔ امی اس
کے غم میں گھلی جا رہی تھیں۔ ایک دن تو انہوں نے کہہ دیا "چاند! تجھے کوئی پسند ہو تو کہہ
دے میں اس کے سامنے جھولی پھیلا کر تیری خوشی مانگ لوں گی!"

اس جملے پر وہ کتنی بے ساختگی سے قہقہہ لگا اٹھی۔ اس نے محسوس کیا قہقہہ بے ساختہ ضرور تھا لیکن دل کی ہوک میں کتنی بے چارگی تھی۔

" امی خوشیاں مانگنے سے نہیں ملتیں۔ یہ تو اپنے آپ چلی آتی ہیں۔ اور جو مانگے سے مل جائے وہ خوشی ہمیشہ یہی احساس دلاتی ہے کہ یہ بھیک ہے۔ کیا چاند کو تم نے بھکارن سمجھ لیا۔ امی اس کی چاندنی خود دنیا کے لئے دان ہے۔" اس کی گہری نظریں امی کے چہرہ کا طواف کرنے لگیں۔

" میری بچی ـــــ تیرا دکھ مجھ سے دیکھا نہیں جاتا۔ میرے بعد تیرا کیا ہوگا ـــــ ؟" ان کی آنکھوں میں ماتا کے شعلے لپک رہے تھے۔

" امی دل چھوٹا نہ کرو۔ جس کا آغاز ہی نہ ہو اس کا انجام کیا ـــــ ؟" وہ، گڈو کا سر سہلاتی رہی۔ امی کی آنکھیں پیمانہ بن گئیں۔ سسکیاں فضا میں تحلیل ہونے لگیں۔

اس شام گڈو کی دوسری سالگرہ تھی۔ چاند سے سنگھار میز پر بٹھائے بال سنوار رہی تھی۔ دفعتاً گڈو نے چاند کے بال کھینچے۔ جھرجھراتی ہوئی ایک لٹ اس کی پیشانی پر آگئی گڈو کھکھلا کر ہنس پڑا۔ چاند نے کنگھا سنبھالا اور بال درست کرنے لگی۔ لیکن دوسرے ہی پل وہ چونک اٹھی۔ چاندی کے تاروں نے اس کی مانگ کو سجانا شروع کیا تھا۔

"اوہ! تو کیا تو بھی مجھے احساس دلا رہا ہے کہ میں بوڑھی ہو رہی ہوں۔ ـــــ" چاند نے گڈو سے سرگوشی کی۔

" ہم ..... مما! گڈو نے اس کے ہونٹوں پر ننھے ہاتھ پھیرے اور چاند نے اسے بھینچ لیا۔ اسی وقت صباحت حمام سے نکل کر جا رہا تھا۔ اس کے قدم رک گئے۔ اس نے دروازے کی اوٹ سے دیکھا۔ چاند گڈو کو نظر کا ٹیکہ لگا رہی تھی

وہ کچھ دیر وہیں کھڑا رہا پھر گردن جھٹک کر آگے بڑھ گیا۔

سالگرہ کی تقریب اختتام کو پہنچی۔ رات کے بارہ بجے جب دودھ کا گلاس لئے وہ صباحت کے کمرہ میں گئی تو وہاں گہرا اندھیرا دیکھا۔ اس نے سوئچ آن کیا۔ کمرہ میں روشنی بکھر گئی۔ صباحت کرسی کے کونے پر سر ٹکائے آنکھیں بند کئے پڑا تھا۔

"صباحت بھیا! دودھ یہاں رکھا ہے۔ یہ آپ نے اندھیرا کیوں کر لیا کمرہ میں؟" اس نے گلاس میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

"تم آگئی ہو نا! اندھیرا خود بخود دور ہو جائے گا!" صباحت نے گہری نظر سے اسے دیکھا۔

"جی ــــ؟" وہ سراپا متحیر تھی۔

"ہاں چاند! اگر تم میرے سیاہ خانے میں نہ جگمگاتیں تو گڈو کو کون سنبھالتا، میرا خیال کون رکھتا؟"

"چاند کا کام تو رکھوالی کرنا ہے" اور وہ باہر نکل گئی۔ اپنے کمرہ میں آکر ہی اس نے دم لیا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ صباحت نے ایسی بات کیوں کہی ــــ؟ وہ سوچتی رہی۔

ادھر صباحت کروٹیں بدلتا ہوا سوچ رہا تھا ــــ میں نے اس کی نظروں میں پیار دیکھا۔ چاہت دیکھی۔ خلوص دیکھا۔ وہ مجھ سے پیار کرتی ہے۔

اسے یاد آیا ایک بار جب اس نے عفت کے گالوں پر سیاہی چھڑک دی تھی تو اجلے رنگ پر سیاہ نقطے گالوں کے حسن کو دوبالا کر رہے تھے۔ چاندنی اس وقت پاس ہی کھڑی تھی۔ صباحت نے اس کے گالوں پر بھی سیاہی چھڑک دی وہ آپ ہی آپ مسکرا اٹھی۔ لیکن دوسرے ہی پل اس کی ہنسی رک گئی۔ صباحت کہہ رہا تھا "چاند!

سیاہی پر سیاہی ڈالنے سے فائدہ نہیں۔ ہاں! البتہ تمہارے گالوں پر خالہ امی کے پاندان کا چونا اچھے لگے گا۔" اور پھر آگے بڑھ کر اس نے انگلی بھر چونا اس کے گال پر لگا دیا۔ اندھیرے میں روشنی کی کرن دور تک کھنچ گئی۔ وہ دونوں ہاتھوں میں منہ ڈھانکے سسک پڑی۔

"ارے..... ارے تم برا مان گئیں میں نے تو یوں ہی مذاق کیا تھا۔" صباحت اسے منانے لگا۔

"بھئی دیکھئے! آپ ہماری چاند کو ایسے نہ ستایئے۔ وہ روٹھ جائے گی تو سارا جہاں اندھیروں میں ڈوب جائے گا۔ میری اچھی بہنا! میری گڑیا! اور مت...." عفو باجی نے اسے سینے سے لگا لیا۔ اور پھر طوفان تھم گیا۔ صباحت کو یاد آیا ایک بار وہ سب کے لئے چند کپڑے لے آیا۔ چاند دور کھڑی تھی اس نے اسے بلایا۔

"دیکھو تم چاند ہو اس لئے تمہارے لئے فلک کا گوشہ اٹھا لایا ہوں تاکہ تم اس پر سج سکو۔" دوسرے ہی پل صباحت کے ہاتھ میں ہلکے آسمانی رنگ کا ایک جھپاتا دوپٹہ لہرا رہا تھا۔ اس نے چاند کے سر پہ دوپٹہ ڈال دیا۔

"ہاں یہ ہوئی نہ کچھ بات۔ اب چاند گہن سے نکلا ہوا معلوم ہوتا ہے!" صباحت نے کہا۔ اور چاند دیوانہ وار آئینہ کی طرف بھاگی۔ صباحت نے اس دن کے بعد سے محسوس کیا تھا کہ وہ صرف آسمانی ہی رنگ پہننے لگی تھی۔ لیکن عفت کی شادی کے بعد اس نے وہ رنگ بھی چھوڑ دیا۔ یہ ساری باتیں صباحت کو یہ یقین دلانے کو کافی تھیں کہ وہ اس سے پیار کرتی ہے۔

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو بیٹا ـــــ ؟" ان کے ہاتھ سے تسبیح چھوٹ گئی۔

"میں سچ کہہ رہا ہوں خالہ امی۔" صباحت مؤدبانہ ان کے سامنے تھا۔

"لیکن چاند ـــــ ؟" وہ رک گئیں۔
"میں اپنی خوشی سے چاند سے بیاہ کرنا چاہتا ہوں۔
"بیٹا! تم نے میرے دل کا بوجھ ہلکا کیا۔ اللہ تمہیں خوش رکھے" امی نے صباحت کی پیشانی چوم لی۔

اسی شام جب امی نے چاند کو بلا کر پاس بٹھایا جبھی اس کا ماتھا ٹھنکا۔
"کیا بات ہے امی ـــــ ؟" وہ ہاتھ سے آٹا چھڑاتے ہوئے بولی۔
"بیٹی! صباحت نے تجھ سے شادی کی پیشکش کی ہے۔ تجھے یہ رشتہ قبول ہے نا؟" انہوں نے اس کا چہرہ اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔
"امی! گڈو کیلئے میں سب کچھ کر سکتی ہوں۔ لیکن ایک بار مجھے ان سے بات کر لینے دیجئے۔" وہ اتنا کہہ کر تیز تیز قدموں سے چولھے کی طرف لوٹ آئی۔ اس کا دماغ سن ہو گیا تھا۔

"مم..... مما گڈو نے پکارا وہ چونک اٹھی۔
"چھن چھن..... چھن! آنسو کا ایک تیز ریلا رواں ہوا۔ اور سلگتی لکڑیوں پر ساز بج اٹھے۔ ایسا سُر کسی ساز میں نہیں...

شب کا آخری پہر تھا۔ آسمان کا چاند زرد ہو چلا تھا۔ ستاروں کی سرگوشیاں خاموش تھیں۔ اس کے قدم آہستہ آہستہ صباحت کے کمرے کی جانب اٹھے۔ وہ کسی کتاب میں کھویا ہوا تھا۔

"ارے چاند ـــــ! تم؟ اتنی رات گئے؟" اس نے کتاب میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

"چاند رات ہی کو نکلتا ہے نا ـــــ؟" وہ پاس رکھے ہوئے اسٹول پر بیٹھ گئی۔

"کہو کیا بات ہے"

"میں آپ سے کچھ پوچھنا چاہتی ہوں"

"پوچھو" وہ ہمہ تن گوش تھا۔

"پہلے یہ بتایئے کہ کیا آپ مجھ سے محبت کرتے ہیں؟" اس نے سوال کیا۔

"یہ کیا کہہ رہی ہو تم ــــ؟ اچھا اگر میں ہاں کہوں تو ــــ؟" اس نے جواب دیا۔

"ہونہہ ــــ!" کہیں ہمدردی کو تو محبت کا نام نہیں دیدیا آپ نے؟"

"تم غلط سمجھ رہی ہو چاند ــــ"

"غلطی پر تو آپ ہیں ۔کیا یہ سچ نہیں کہ آپ محض گڈو کے لئے اس شادی پر آمادہ ہیں؟"

"صرف گڈو ہی کیوں ــــ تمہارے لئے بھی!"

"میرے لئے کیوں ــــ؟" وہ بولی۔

"اس لئے کہ میں جانتا ہوں کہ تم مجھ سے پیار کرتی ہو۔ تم اس رشتے سے خوش رہو گی"

"پچھلے چند برس سے شائد آپ نے کبھی یہ بات محسوس نہ کی تھی ۔صباحت بھیا! کچھ جذبے ایسے ہوتے ہیں جو راہ چلتے چلتے جاگ اٹھتے ہیں ۔اور پھر منزل تک پہونچنے سے پہلے ہی سو بھی جاتے ہیں۔ جب دل جوان تھا تب امنگیں بھی جوان تھیں ۔ آرزوں پر بھی شباب تھا ۔لیکن اب ان میں بھی بڑھاپا آ گیا۔ وہ بھی تھک کر سو گئیں ۔میں جانتی ہوں آپ کو مجھ سے پیار نہیں ۔ صرف ہمدردی ہے ۔ رحم ہے ۔میں اس بھیک سے تنگ آ چکی ساری زندگی میرے حصہ میں صرف رحم ہی رحم رہا۔ اب آپ بھی اگر یہی خیرات دینا

چاہتے ہیں تو میرا کشکول کبھی آگے نہ بڑھے گا۔ سہ

ایسے جینے سے جو موت آتی تو اچھا ہوتا

وہ سمجھتے ہیں کہ اب رحم کے قابل ہو لیں

"چاند ــــ! تم کیا کہہ رہی ہو؟ صباحت نے حیرت سے پوچھا۔

ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہوں۔ آپ باجی سے پیار کرتے ہیں۔ اور میرے لئے آپ کے دل میں صرف ہمدردی ہے۔ مجھے خدا کیلئے احساس کی اس صلیب پہ نہ لٹکایئے، جہاں میرا دم بھی پورا نہ نکل سکے۔ مجھے اپنی کچلی ہوئی تمناؤں کا غم نہیں۔ یہ نصیب کی بات ہے۔ کوئی پھول پاکر نازاں رہتا ہے اور کوئی کانٹوں کے زخم کو سہن کر سکتا ہے۔ کیونکہ یہی خار تو دل کے ہر آبلے کو پانی کرتے ہیں۔ گڈو کے لئے میں سب کچھ کرنے کو تیار رہوں۔ لیکن آپ جو چاہتے ہیں اس کی تکمیل کے لئے کچھ میری فراموش کی ہوئی تمناؤں کا بھی حصہ ہوگا۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ تکمیل آرزو کی لذت ایثار و قربانی سے ملتی ہے۔ تکمیل حیات اور دل کیلئے خود کو مٹا دینے میں ہے۔ یہی تقاضائے زیست بھی ہے اور یہی مدعائے الفت بھی ہے۔ آج گڈو ہم سے پیار چاہتا ہے۔ ضروری نہیں کہ ہم ازدواجی بندھن میں بندھ کر ہی اسے پیار دیں۔ ہم بہن بھائی کے رشتہ کو جوڑ کر بھی ذمہ داری کو نبھا سکتے ہیں۔" چاند کھوئی کھوئی سی کہہ رہی تھی۔

"لیکن ۔۔۔۔ چندا! تم تو مجھ سے محبت کرتی تھیں نا!" صباحت بوکھلا گیا۔

"وہ اور وقت تھا بھیا! میں نے کہا نا آپ سے، جذبوں کے کھیل نرالے ہوتے ہیں۔ یہ کبھی جلا دیتے ہیں تو کبھی جلا دیتے ہیں۔ جلنے سے بہتر جلا پانا ہے۔ اگر آپ نے اس رشتے کو قبول کیا تو آپ بھی عفو باجی کو دھوکا دینے سے بچ جائیں گے۔ اور میں

حشر میں ان سے اس لئے شرمندہ نہ رہ سکوں گی کہ محض اپنی محبت کی تکمیل کیلئے میں نے گڈو کی ماں بننا قبول کیا۔" چاند پوری آب و تاب کے ساتھ چمک اٹھا۔

"چاند ـــــ! بس کرو۔ بہت ہو چکا۔ میں اپنے خیالات پر نادم ہوں۔ تم بے شک اجالا ہو اندھیرے دلوں کا۔ مجھے معاف کر دینا میری بہن!" اور صباحت اس کے آگے جھکتا ہی چلا گیا۔

چاند بہت پُرسکون انداز سے فلک پر دوڑ رہا تھا۔ وہ اپنے بستر پر پہلی بار سکون کی نیند لے رہی تھی۔ دفعتاً گڈو کسمساتا ہوا اٹھا اور رونے لگا۔ چاند کی آنکھ کھل گئی۔ اور وہ اس کے لئے دودھ گرم کرنے باورچی خانے کی طرف چلی گئی۔

دوسرے ہی پل ایک خوفناک آواز آئی۔ اس آواز پر صباحت دوڑ پڑا۔ اس کے پیچھے امی بھی چلی آئیں۔ وہاں جاکر دیکھا تو چاند کو شعلوں میں گھرا پایا۔ اسٹوو کے پھٹ پڑنے سے چاند جھلس گئی تھی۔ صباحت نے بہت مشکل سے آگ بجھائی۔ اور اسے اندر لے آیا۔ وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔ وہ اسے بستر پہ لٹاکر ڈاکٹر کے پاس دوڑا۔

"پانی ...." دبی سی آواز اس کے بے جان لبوں سے نکلی۔ صباحت ڈاکٹر کو لے کر آچکا تھا۔

"آہ .....!" وہ کراہ رہی تھی۔ ڈاکٹر نے اسے دیکھا۔ اس کا جسم بری طرح جھلس گیا تھا۔ گوشت کی گلابی رنگت اس کے سیاہ رنگ کو چیرتی ہوئی باہر آنے کو بیقرار تھی۔ جیسے فلک کا چاند بادلوں سے بے نقاب ہونے کی سعی کر رہا ہو۔

"یہ دوائیں لکھ رہا ہوں۔ لیکن مریض کو دوا سے زیادہ دعا کی ضرورت ہے یہ بری طرح جھلس گئی ہیں"۔ ڈاکٹر چلا گیا۔

"صباحت .... بھیا .... چاندنی .... میں تو ڈھونڈ کر .... رہتی .... ہے نا

..... مگر .... آج .... یہ شعلے .... کہاں سے .... نکل رہے ہیں ؟" وہ کراہتی ہوئی بولی ۔

"چاند ــــ ! تم مایوس نہ ہو" وہ اور تسلّی نہ دے سکا ۔ اس کی آنکھیں خود ڈوب رہی تھیں ۔

"بھیا .... میرے گڈو .... میری امی .... کا .... خیال رکھنا !"

"چندا .... میری بہنا ! .... مت رو !" صباحت بلک اٹھا ۔ اس نے چاند کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا ۔ نرم نرم ہاتھ جس پر سفید آبلے تھے ۔ صباحت کا ہاتھ لگتے ہی پھوٹ پڑے ۔

"آہ .... !" وہ کراہ اٹھی ۔

"چندا .... میری گڑیا .... میری بہنا !" اس نے ان آبلوں کو آنکھوں سے لگا لیا ۔ جبھی اسے محسوس ہوا کہ صبح کے وقت پھولوں پر گرے ہوئے شبنم کے قطرے ساری رات سسکتی ہوئی چاندنی کے آنسو ہیں ۔ جیسے دنیا پھول کی زندگی سمجھتی ہے ۔ جو ساری رات فضا کو جگمگاتی ہے ۔ وہ کتنی اکیلی اور اداس ہے !!

("بیسویں صدی" اکتوبر ۱۹۶۲ء)